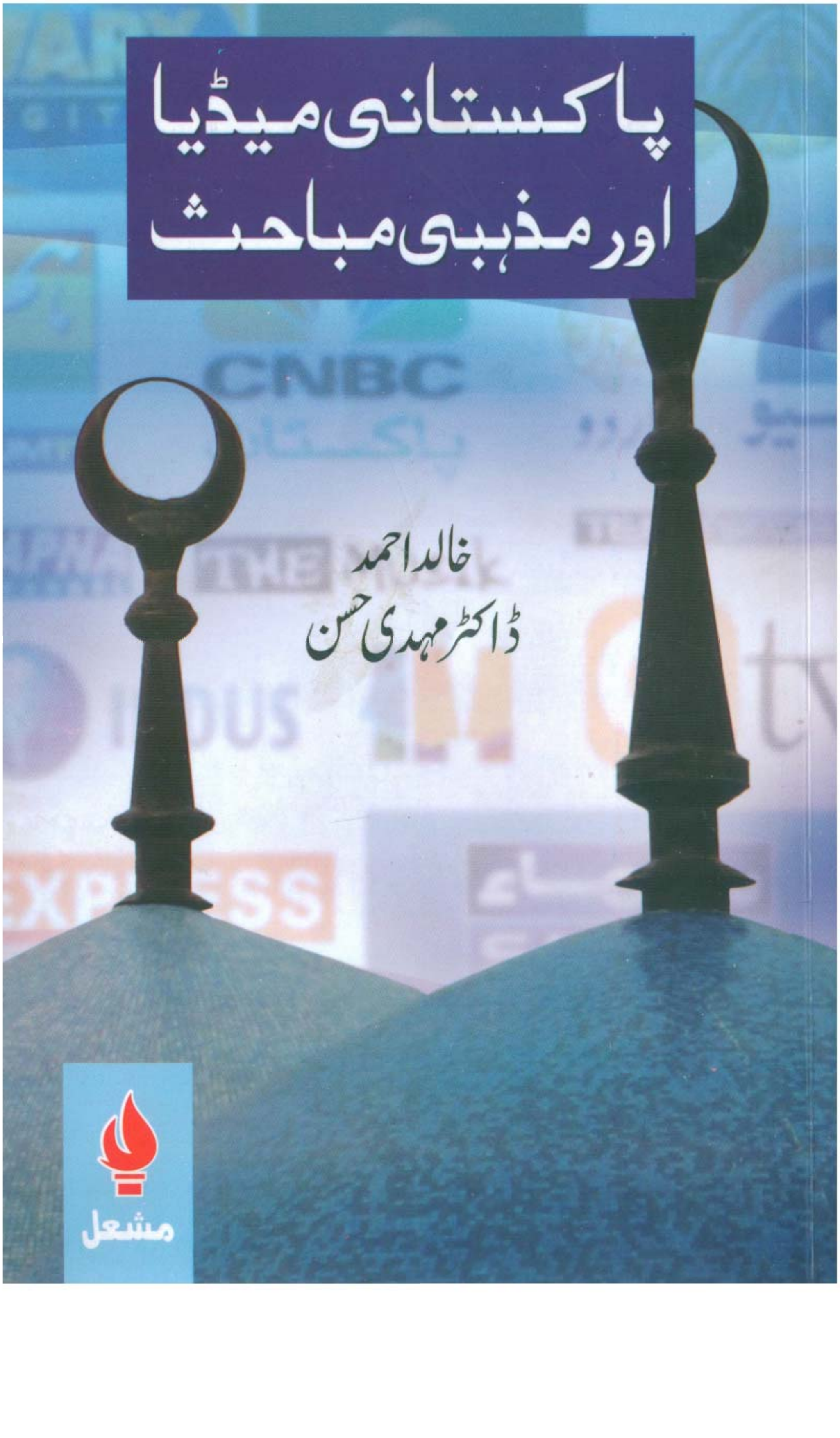
پاکستانی میڈیا
اور مذہبی مباحث
CNBC
خالد احمد
ڈاکٹر مہدی حسن
مشعل

پاکستانی میڈیا اور مذہبی مباحث

خالد احمد
ڈاکٹر مہدی حسن

ترجمہ: توقیر عباس

مشعل بکس

آر-بی 5، سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس

عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور-54600، پاکستان

پاکستانی میڈیااور مذہبی مباحث

خالداحمد
ڈاکٹرمہدی حسن

ترجمہ: توقیرعباس

کاپی رائٹ اردو © 2013 مشعل بکس

ناشر: مشعل بکس
آر-بی-5، سیکنڈ فلور،
عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیوگارڈن ٹاؤن،
لاہور-54600، پاکستان

فون وفیکس: 042-35866859
Email: mashbks@brain.net.pk
http://www.mashalbooks.org

پرنٹرز: بی پی ایچ پرنٹرز، لاہور

قیمت: -/140 روپے

فہرست

پاکستانی ٹی وی چینلز پر مذہبی مباحث 5

مابعد نائن الیون گرم بازاری کے تحت اسلامائزیشن 9

اونچے طبقے کا اسلام اور اس کے میزبان 13

معتدل مبصرین کی کمی 17

علما اور ان کی یک زبانی کا فائدہ 19

ریاستی جواز کو چیلنج 21

جمہوریت اور میڈیا: توازن کی نئی اخلاقیات کی ضرورت 23

جہاد اور سرکش علاقوں کی تخلیق 25

نیشنل سیکورٹی کے لیے انتظامی قربانی 27

پاکستان کے چھ ریاستی ستون 31

کیا میڈیا پاکستان میں اچھے انتظام کو فروغ دے رہا ہے 39

دہشت گردوں کی مدد 45

عبدالرشید غازی ہیرو بنا دیا گیا 49

جہادی اور ان کے سرپرست 53

پاکستانی ٹی وی چینلز پر مذہبی مباحث

خالد احمد

نئے پرائیویٹ ٹی وی چینلز پر زیادہ مقبول پروگرام کا تعلق غالباً مذہب سے ہے۔ بعض چینلز تو علما کے ریکارڈ شدہ لیکچروں کے لیے مخصوص ہیں۔ یہ علما اسلام کے اساسی قوانین پر بحث کرتے ہیں۔ لیکن بعض معاملات میں ایک سے زیادہ نقطہ ہائے نظر پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جس کے نتائج بہت مختلف اور متاثر کن ہیں۔ بعض دفعہ ناظر مسلمانوں سے مایوس ہو کر ٹی وی بند کر دیتا ہے کہ مسلمان کبھی اکیسویں صدی سے مصالحت و مفاہمت نہیں کر سکتے۔ اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ ماہرین کی دانش مندانہ استعداد اور قابلیت اتنی نہیں کہ وہ اس بلندی پر آ کر بات کریں جس کی کوشش علامہ اقبال نے اپنے خطبات 'اسلامی فکر کی تعمیرِ نو' میں کی تھی۔ بڑے دکھ کی بات ہے کہ ٹی وی چینلز علامہ اقبال سے پہلے کا مذہبی نقطہ نظر پیش کرتے ہوئے اسلامی عمرانیات کے خلاف مقبول ردعمل کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔

جب کبھی یہ چینلز تصویر کے دونوں رخ پیش کرنے میں کامیاب ہوئے، اس کا نتیجہ بہت صحت بخش رہا ہے۔ تقریباً ہر روز پاکستانی مذہبی دھڑوں کے نقطہ ہائے نظر کا اختلاف سامنے آتا ہے۔ یہ کام اس وقت ہوتا ہے جب دو مبصر گفتگو میں شامل ہوتے ہیں لیکن بات زیادہ تر معاملات میں مختلف مسائل پر رجعت پسندانہ اجماع تک رہتی ہے اور اسی کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے جس سے پریشانی اور عدم اطمینان پیدا ہوتا ہے۔ اصل میں مذہبی ماہرین کے ساتھ غیر مذہبی ماہرین کو بٹھانے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی جاتی کہ جس سے ایک حقیقت پسندانہ نقطہ نظر پیش ہو سکے۔ اکثر

دانش وران طاقت ور مذہبی ملاؤں کا سامنا بھی نہیں کرنا چاہتے، جو کسی بھی بات پر شرک اور بدعت کا فتویٰ جڑ سکتے ہیں۔ اس معاملہ میں ٹی وی چینلز پر زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ انہیں مناسب اور صحیح مبصر دستیاب ہونے تک انتظار کرنا چاہیے تا کہ مفید بحث ہو سکے۔

مثال کے طور پر 23 جنوری 2003ء کو ایک ٹی وی چینل نے حجاب (برقعہ) کے موضوع پر مباحثہ کروانے کی کوشش کی، جس میں مبصر اس بات کے قائل تھے کہ کوئی عورت بغیر حجاب کے گھر سے باہر نہیں جا سکتی لیکن حجاب کی سختی پر اور پردے داری پر ان کی آراء میں اختلاف تھا۔ ایک فریق کا کہنا تھا کہ چہرے کے ایک حصے کے علاوہ پورا جسم ڈھکا ہوا ہونا چاہیے جبکہ دوسرے فریق کا کہنا تھا کہ ٹوپی والا برقعہ ہو جس کی حمایت طالبان کرتے ہیں۔ ایک اور ٹی وی چینل پر ڈاکٹر اسرار نے قرآن کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ کس طرح حضور ﷺ کی بیویاں چادر کے ساتھ جسم ڈھانپا کرتی تھیں اور جب وہ مدینہ سے باہر جاتیں تو ان کے چہرے پر ایک اضافی نقاب بھی ہوتا تھا۔ انہوں نے مزید بتایا کہ اس کا مقصد انہیں برے آدمیوں کے شر سے بچانا تھا جو بے حجاب عورتوں کو چھیڑا کرتے تھے لیکن مسلم خواتین کو حجاب کی وجہ سے کچھ نہیں کہتے اور جانے دیتے تھے۔ پاکستانی سماج میں مذہبی دھڑے الٰہیاتی پیغام سے جو فتویٰ اخذ کرنا چاہتے ہیں وہ بہت شدید اور ناقابل عمل ہے۔ اگر اس حوالے سے کوئی قانون نافذ ہوتا ہے تو نہ صرف پاکستان بلکہ پوری اسلامی دنیا میں فساد پھیل جائے گا۔

دلچسپی کی بات یہ ہے کہ فرحت ہاشمی، جو برقعہ اوڑھنے والی خواتین کی رہنما ہے، اپنے ٹی وی پروگرام میں اس طرح آتی ہے کہ برقعہ سے اس کی صرف آنکھیں باہر ہوتی ہیں۔ یوں برقعہ اوڑھنا ان قوانین کی خلاف ورزی ہے جن پر دوسرے پروگرام میں بحث ہوئی تھی۔ پیرس میں مسلمانوں کا حجاب صرف سکارف کے ساتھ بالوں کو ڈھانپنا ہے۔ بذات خود پاکستان میں خواتین کی اکثریت، جو ملازمت پیشہ ہے، وہ کسی قسم کا برقعہ نہیں اوڑھتیں، جبکہ کچھ دیگر خواتین مختلف قسم کے برقعے اوڑھتی ہیں اور کچھ فرحت ہاشمی کی طرح برقعہ یوں اوڑھتی ہیں کہ ان کی آنکھیں صاف نظر آ رہی ہوتی ہیں۔ پشاور میں حسبہ ایکٹ کے نفاذ کے بعد متحدہ مجلسِ عمل (ایم ایم اے) کیا کرے گی اور اگر پنجاب اور سندھ اپنے بڑے شہروں میں اس قانون پر عمل درآمد نہیں کریں گے جہاں دفاتر میں خواتین کی تعداد بڑھ رہی ہے اور وہ مردوں کے ساتھ کام کرتی ہیں تو اس حجاب کا

کیا فائدہ ہوگا۔ یہ مذہبی دھڑے پاکستان پیپلز پارٹی (پی پی پی) کے بارے میں کیا فیصلہ کریں گے جس کی رہنما برقعہ نہیں اوڑھتی اور بھاری اکثریت سے جیت جاتی ہے۔ پاکستانیوں کی اکثریت یہ سوچتی ہے کہ سر کو ڈھانپ کے رکھنا کافی ہے۔ جارحیت پسند علما کے طبقے کے سامنے ست ہونے کے بجائے ٹی وی چینلز کو تھوڑا مزید کام کر لینا چاہیے۔ اپنے مذہبی پروگرام کے لیے پہلے درست مقررین کا انتخاب کریں۔ علاوہ ازیں ان پروگراموں کے میزبانوں کو بھی کم چاپلوس اور خوشامدی ہونا چاہیے۔ مذہبی پروگرام کو کیسے متوازن رکھا جا سکتا ہے اور مذہب میں مزید بہتری کیسے لائی جا سکتی ہے، اس کی بہترین مثال پی ٹی وی کا سوال جواب کا مذہبی پروگرام تھا جو 23 جنوری 2004ء کو نشر ہوا، جس میں مہمان عالم دین حسین محمد جعفری تھے، جنہوں نے اسلام کے ابدی اصولوں اور بدلتے زمانے میں ان کے نفاذ پر واشگاف الفاظ میں شاندار انداز میں بات کی۔ انہوں نے اکیسویں صدی کے پاکستان کے لیے کئی مسائل کو بہت آسان کر دیا اور کہا کہ اسلام کے بنیادی اصولوں کو قائم رکھتے ہوئے ان کے نفاذ میں تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ اس نے مزید کہا کہ اس بات پر نبی اکرم ١ کے ساتھیوں نے عمل کیا لیکن قرون وسطیٰ میں مسلمانوں نے تقلید کی وجہ سے اسے ترک کر دیا۔ انہوں نے مزید کہا کہ مسلمان اسلام کے قدیم پیغام کو سیاست کے ساتھ جوڑ کر بہت بدسلوکی کر رہے ہیں، تاہم کسی بھی حالت میں ان ابدی مباحث کا کیا فائدہ جب ایران نے سنگساری کی ممانعت کر دی ہے اور مصر نے سود کو جائز قرار دیا ہے۔

ایک وقت تھا پاکستان ٹیلی ویژن (پی ٹی وی) آمروں کے لیے اسلامی جھنڈا لہرانے کی خاطر برین واشنگ کرتا تھا۔ اور کئی برس تک نظریے کو دانش مندانہ انداز میں سلجھانے اور حل کرنے سے کنی کترا تا رہا۔ اور یوں اس نے بہت سے کڑوے اور سخت گیر مولویوں کو طاقت اور قوت بخش دی۔ آج ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پرائیویٹ ٹی وی چینلز غیر شعوری طور پر یہی کر رہے ہیں۔ وہ بھی عوامی ذہن کو کچھ اسی قسم کا کام سکھانا چاہتے ہیں۔ اس لمحے ریاست کا اپنا چینل پی ٹی وی اس پُرتشدد ماحول میں بہت معتدل آواز بن چکا ہے۔ یہ نتیجہ اخذ کرنا ذرا مشکل نہیں کہ میڈیا کی رائے کے ذریعے پاکستان اس تشدد پسندی سے باہر آ سکتا ہے۔ پرائیویٹ ٹی وی چینلز کا فرض ہے کہ وہ اپنے مذہبی پروگراموں کو احتیاط سے دیکھیں اور اُن میں سے پُرتشدد خیالات کو خارج کر دیں۔

مابعد نائن الیون گرم بازاری کے تحت اسلامائزیشن

خالد احمد

پاکستان میں1948ء سے قراردادِ مقاصد کے تحت اسلامی عمل کا آغاز ہوا۔ اس کی انتہا جنرل ضیاالحق کی فوجی آمریت کے دور حکمرانی (1979ء-1988ء) میں ہوئی جب اس نے جبری طور اسلامی دفعات قوانین میں داخل کر دیں۔ جنرل ضیا کے بعد ریاست نے واپس پہلی حالت میں جانے کی کوشش کی لیکن حکومتیں اتنی مضبوط نہیں تھیں کہ اس عمل کو ختم کر دیا جاتا۔ دو مثالوں میں صدر نے منتخب حکومتوں کو آرٹیکل 58 ٹو-بی کے تحت ختم کیا۔ ان پر یہ الزام بھی تھا کہ حکومت نے اسلامائزیشن کے عمل کو روک دیا ہے یا نظرانداز کر دیا ہے۔1995ء میں کامیاب فوجی حملے کے تحت ڈی اسلامائزیشن کا عمل ہوا جس کی بنیاد پر حملہ کیا گیا تھا۔1998ء کے بعد وزیراعظم نواز شریف نے پندرہویں ترمیم کے تحت اسلامائزیشن کو دوبارہ شروع کیا لیکن وہ دوبارہ ناکام ہوا۔

جنرل پرویز مشرف کے دور میں ڈی اسلامائزیشن کا عمل شروع ہوا۔ اس کے لیے بالواسطہ عالمی دباؤ بھی تھا۔ یہ سب کچھ اقوام متحدہ کی سکیورٹی کونسل کی قرارداد1373 کے چارٹر کے ساتویں باب کے تحت ہوا۔ عام طور پر کسی بھی حکم کو کسی جبر اور تشدد کے تحت اسے عام حالت میں لایا اور اسے ختم کیا جا سکتا ہے۔ عام طور پر قوانین ناقابلِ تبدیل ہوتے ہیں لیکن حکومت ان کے نفاذ کو کالعدم کر دیتی ہے۔ ایک مخالف دعویٰ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ اگر کوئی پرتشدد حکم معاشرے کو بدلنے کے مقصد کے تحت ہو اور اسے چند برس تک قائم رکھا جائے تو مطلوبہ معاشرہ اسے خود میں جذب کر لیتا ہے اور اس کے اثرات معاشرے میں سرایت کر جاتے ہیں۔ یوں عوام کی طرف سے

اسلامائزیشن کا مطالبہ ناقابلِ تخفیف ہو جاتا ہے۔ پاکستان کے حوالے سے اظہارِ خیال اُتنا شدید رہتا ہے جتنا جنرل ضیا کے دور میں تھا کیونکہ عوامی ذہن آمریت کی پوری دہائی میں سیکولر اظہارِ خیال سے ناآشنا ہو چکا ہے۔ جب 2000ء میں پرائیویٹ ٹی وی چینلز کھل گئے، اس وقت مالکان عوام کی طرف سے مذہبی پروگراموں کی طلب دیکھ کر ششدر رہ گئے۔

پاکستان میں ٹی وی پر مذہبی ابلاغ کا عمل مارکیٹ کا پیدا کردہ ہے اور یہ متشدد بنیاد پرستوں کی لذتِ کام و دہن کا سبب بنتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ استخارہ ٹائپ اور جادو ٹونے قسم کے پروگرام اور ان پر اظہارِ خیال کو بھی تقویت ملی۔ جنرل ضیا کی آمریت میں ریاست کا صرف ایک ٹی وی تھا جبکہ جنرل پرویز مشرف کے دور میں کئی پرائیویٹ ٹی وی چینلز تھے اور ان پر مذہبی مباحث ہوتے تھے لیکن جنرل ضیا نے جو کچھ ایک ٹی وی چینل سے حاصل کیا وہ کئی گنا زیادہ ہے۔ اسلام کے لیے اس بھاگ دوڑ نے ابتدائی جہادی مذہبی طبقے کو خوب امداد دی جو ریاست کے متوازی طاقت کا ایک مرکز بن چکے تھے۔ یونائیٹڈ نیشن کمیٹی نے 1373 کی قرارداد کے تحت دہشت گردی کی روک تھام کے لیے جن تنظیموں پر پابندیاں لگائی تھیں وہ موجود رہیں اور پرائیویٹ اسلامائزیشن کے لیے اپنی قوتیں صرف کرتی رہیں۔ درحقیقت 2002ء میں جنرل پرویز مشرف نے ملحدانہ جذبات کے تحت جب یہ اعلان کیا کہ شہروں پر جہادی قابض ہو جائیں گے اور لوگوں کو زبردستی اسلامی بنانے پر مجبور کریں گے تو اس بات نے جہادی اور فرقہ پرست مذہبی دھڑوں کو بہت حوصلہ دیا۔

11 ستمبر 2001ء کو ٹی وی پر اظہارِ خیال بہت شدید اور سخت ہو گیا کیونکہ اس پروگرام کو ہراوّل دستہ کے طور پر لیا گیا۔ اس کا میزبان ایک مولوی تھا جو پرویز مشرف کی طرف سے امریکہ کی تابع فرمانی سے ڈرتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پرویز مشرف نے متشدد مذہبی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی۔ یہ سب کچھ بعد میں ہوتا نظر آتا ہے، جب پرویز مشرف نے مدارس کے نصاب، جو نظریاتی باتوں سے بھرا ہوا تھا، اسے معتدل کرنے کی کوشش کی۔ اس کا مزید مرکب اسلامی عالمِ جہالت کی شکایت سے تیار کیا گیا جسے 2003ء میں امریکہ کے عراق پر حملے سے مزید تقویت ملی۔ چونکہ اس حملے کی پاکستانی معاشرے میں ہر سطح پر مخالفت ہوئی۔ ٹی وی نے اس اظہارِ خیال کو ایک نئی برتری کے ساتھ منعکس کیا۔ مقرر بھی نیا تھا۔ نئے ٹی وی چینلز کی ابتدا چونکہ پاکستان سے باہر ہوئی، اس لیے بعض دفعہ مغرب اور مغربی میڈیا کے خلاف خاص مقصد کے تحت بیانات کی ابتدا بھی ہوئی اور

مذہبی مباحث میں واضح جھکاؤ بھی ظاہر کیا گیا جس سے پاکستان کی فضا میں تناؤ اور دشمنی کا ماحول پیدا ہوا اور بربریت پیدا ہوئی۔ نتیجتاً ایک دوسرے کو مخالف سمجھا جانے لگا اور دوسروں کے نقطہ نظر کو سمجھنے کے قابل نہ سمجھا گیا۔ ٹی وی نے پھر ایک اور قسم کے دکھ کا اظہار شروع کر دیا جس میں عالمی ناانصافی کے خلاف احتجاج بہت کم جبکہ اسلامی حاکمیت کی نااہلی کا دکھ زیادہ تھا۔ جو کچھ ہو رہا تھا اس سے کیبل ٹی وی نے بھی خوب فائدہ اٹھایا اور اپنا کمرشل ازم شروع کر دیا اور کئی چینل صرف ایک مولوی کے لیے مختص کر دیئے۔ مثال کے طور پر چکوال کا اکرم اعوان، جو واضح طور پر مسلح افواج کے ساتھ کھڑا تھا۔ ڈاکٹر اسرار احمد، جس نے لاہور میں ایک تنظیم قائم کی جس کا مقصد خلافت کا قیام تھا۔ انڈیا کا ذاکر نائیک، جو دنیا کو بدلنے کی خواہش رکھتا ہے۔ ساؤتھ افریقہ کا مرحوم احمد دیدات، 'الہدیٰ' کی مس فرحت ہاشمی، جو پیدائشی امیر خاتون ہے۔ علامہ طاہر القادری، جو لاہور کی مذہبی پارٹی کا بریلوی رہنما ہے اور جس کی شہرت یورپ سے آگے تک ہے۔ آخری دو شخصیات کے بارے میں افواہ ہے کہ وہ پاکستان چھوڑ کر کینیڈا اور یورپ جا بسے ہیں جہاں وہ منفعت بخش تبلیغ میں مصروف ہیں۔ پاکستان میں ان دونوں شخصیات کے اپنے اپنے ادارے کام کر رہے ہیں۔ کئی قسم کے ریکارڈڈ پروگراموں میں دیگر مذاہب کے مبلغین سے مسلم علما کو مناظرہ جیتتے دکھایا گیا۔ ایک ٹی وی چینل نے تو ڈاکٹر اسرار احمد کو یہاں تک استعمال کیا کہ اسے یہ پیغام پھیلاتے سنایا گیا کہ بہت جلد امام مہدی کا ظہور ہونے والا ہے جو بدی کی طاقتوں سے حتمی جنگ کر کے اسلام کو فتح یاب کرے گا۔ میڈیا نے معاشرے کے ذہن پر کتنے اثرات مرتب کیے اس کا ثبوت یہ ہے کہ پاکستان کے ہر شہر سے کئی امام مہدی ظاہر ہوئے اور انہیں گرفتار کیا گیا۔

پرائیویٹ ٹی وی چینلز کی وجہ سے جنرل پرویز مشرف کا دور دراصل اثرات کے حوالے سے اسلامی دور تھا بہ نسبت ضیا کے دور کے۔ اصل میں اسلامی اظہارِ خیال کا لب ولہجہ بہت جارحانہ تھا۔ اگرچہ اس میں بگاڑ نہیں تھا اور سیکولر اور معتدل لوگوں کو آگے آ کر بات کرنے اور مقابلہ کرنے کی بھی آزادی تھی تاہم اس سے تیز مزاجی اور غصہ پیدا ہوتا تھا اور نوجوان سامعین بڑھ کر دفاعی مورچے سنبھالتے اور مذہبی مبصرین کا دفاع شروع کر دیتے تھے۔ قرآن اور حدیث سے حوالہ نہ دے سکنے کی وجہ سے معتدل مبصرین امتحان میں مبتلا ہو جاتے تھے اور ان کا لہجہ معذرت خواہانہ ہوتا تھا۔ جبکہ ڈائس پر ان کے نقطہ نظر کے خلاف خیالات کا ہجوم ہوتا تھا۔ سامعین ان بیرونی آرأ سے

متاثر نظر آتے جن کے ذریعے ٹی وی چینل بذات خود ایک نقطہ نظر پیدا کرتے تھے۔ باجماعت نماز کا مظاہرہ جنرل ضیا کے دور میں اور اس کی موت کے بعد دیکھنے میں آیا لیکن مساجد کی صحیح حاکمیت اور تسلط پرویز مشرف دور میں نظر آیا۔ اصل میں یہ سب پرویز مشرف کی لبرل پالیسی بمقابلہ میڈیا کا کھیل تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ خود کو جینوئن محسوس کرنے والے اور اپنی فکر میں راسخ لوگ سوچتے تھے کہ وہ آزادی کی فضا میں تبدیلی کا سبب بنے ہیں۔ دوسری طرف سیکولر سوچ رکھنے والے لوگ تھے۔ وہ خلائی اقدار کو پیش کرتے نظر آتے تھے اس لیے ان کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔

اونچے طبقے کا اسلام اور اس کے میزبان

خالد احمد

ٹی وی چینل کے مذہبی مبصرین اور سامعین کے درمیان وہ دلخراش لمحہ بھی آیا جب اسلامی تصوف کے مدّعی کا تمسخر اڑایا گیا۔ پاکستان کا کلچر بریلوی مزاج ہے جو رقص اور موسیقی کے ذریعے صوفیا کے سلسلے برقرار رکھتا اور اس کی اجازت دیتا ہے۔ پاکستان میں صوفی سلسلے کی روایت کا سب سے بڑے نمائندہ مرحوم اشفاق احمد تھے۔ جو ڈراموں اور افسانوں کا مقبول لکھاری تھے۔ وہ سرکاری ٹی وی پر ایک ہفتہ وار پروگرام کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ کسی مکالمے کی شکل میں ظاہر نہیں ہوا بلکہ صوفی ازم کو یکسر رد کر دیا گیا۔ اشفاق احمد نے اہلحدیث عالم شیخ سمرودی اور بریلوی عالم صبیحہ قادری سے گفتگو کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ سپین سے مسلمانوں کو بے دخل اور قتل اس لیے کیا گیا کہ وہاں کوئی مسلمان بابا یا صوفی نہیں تھا جو انہیں دعوت دیتا کہ اچھے مسلمان بنو۔ انہوں نے کہا کہ بھارت مسلمانوں کے صوفیا کی وجہ سے محفوظ رہا۔ وہ لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے ان کے لیے زندگی کو آسان بناتے تھے۔ دو سماجی سائنسدانوں نے فون کیا کہ پیری مریدی کوئی چیز نہیں بلکہ یہ جھانسا اور فریب ہے جس کا سبب ناخواندگی ہے۔ شیخ سمرودی نے اشفاق احمد کو یاد دلایا کہ افغانستان میں کوئی ''بابے'' موجود نہیں، صرف طالبان ہیں جو پیری مریدی پر یقین نہیں رکھتے۔ اس نے مزید کہا کہ اسلام میں تصوف کے لیے رہبانیت کی اجازت نہیں۔ اسلام کے قائم کردہ معاشرے میں ''بابوں'' کی کوئی جگہ نہیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ سپین مسلمانوں کے عیش وعشرت کی وجہ سے اُن کے ہاتھ سے گیا، نہ کہ اس وجہ سے کہ وہاں ''بابے'' نہیں تھے۔ اس مکالمے نے مقبول

مذہب اور ریاست کے اونچے درجے کے مذہب کے درمیان ہر قسم کی مفاہمت کے امکان کو ختم کر دیا۔ سماجی سائنسدانوں نے پاکستان میں انتہا پسندی کو ہوا دینے والے مکتبِ فکر کا نادانستہ طور پر ساتھ دیا۔ وہاں موجود بریلوی عالم نے اپنی بریلوی حیثیت سے دست بردار ہونے کا فیصلہ کیا اور اشفاق احمد کو مذاق کا نشانہ بننے دیا۔ میزبان نے جس قسم کے مکالمے کا وعدہ کیا تھا ایسا کوئی مکالمہ نہ ہو سکا۔ مذہب کے اس رُخ کو سرِ دست رد کر دیا گیا۔ مغرب پر حملہ کر کے بنیاد پرست مذہبی دھڑے کی بنیاد کو چھونے کی کاوش بھی کام نہ آئی۔ اسلامی تصوف اپنی فلسفیانہ بنیادوں پر دیگر عقائد سے مکالمہ کرنے کی اہلیت ضرور رکھتا ہے۔

ٹی وی میزبانوں نے مڈوائف کا کردار ادا کیا ہے۔ علما کے ساتھ تمام میزبانوں نے خوشامدانہ رویہ روا رکھا اور ان کے تمام تر جارحانہ اظہارِ خیال کو بغیر کسی چیک کے نشر ہونے دیا۔ میزبان جن موضوعات پر بحث کر رہے تھے ان کی وہ خود زیادہ جانکاری نہیں رکھتے تھے۔ یہی جہالت اُن کی خوبی بن گئی کہ وہ علما اور سیکولر لوگوں سے برابری کا سلوک کرتے رہے۔ لیکن اس جہالت کا فائدہ مذہبی مبصر کو ہوا۔ زیادہ تر مباحث سے یہی بات عیاں ہوتی ہے کہ میزبانوں نے کسی قسم کی کوئی مداخلت نہ کی اور جب سیکولر مبصر کے ساتھ مولوی اور سامعین نے برا سلوک کیا تو اس سے صرف اتنا اطمینان حاصل کیا گیا کہ اسلام کو فتح یاب اور سیکولر معتدل شخص کو ہار تسلیم کرنے پر مجبور کیا گیا۔ سامعین، جن کا انتخاب میزبانوں کو سننے کے لیے کیا گیا، اور انہیں مختلف سوالات کرنا تھے، وہ بھی اس بحث میں شریک ہو گئے۔ اگرچہ یہ کام بلا ارادہ ہوا مگر اس سے معاشرے کا نقطہ نظر سامنے آیا جو خود کو حکومت کی مخالفت میں دیکھے جانے میں فخر محسوس کرتا تھا۔ جہاں علما کے مذہبی پروگرام شفا اور بیماری سے متعلق تھے اور مارکیٹنگ کے تھے وہاں علما سے تعظیم و تکریم کا سلوک رہا، انہیں ایک طرح سے دیوتا بنا کر پیش کیا گیا۔ خاص طور پر 'عالم آن لائن' اور 'استخارہ' جیسے پروگراموں میں ان کی بہت تعظیم کی گئی۔

چونکہ بڑے پرائیویٹ ٹی وی چینل دیگر ممالک میں قائم تھے اس لیے وہ جلاوطن پاکستانیوں کے رویوں کو منعکس کرنے اور پیش کرنے کے قابل تھے۔ جلاوطن پاکستانی مسلم کی انتہا پسندی کا صحیح مطالعہ نہیں کیا گیا تھا سوائے ان چند باتوں کے جو برطانیہ میں رہنے والے پاکستانیوں کے بارے میں دستیاب تھیں یا کچھ علما کے حاصل مطالعہ سے جو معلوم ہوا، انہی کا علم تھا۔ ان ٹی وی چینلز نے

پاکستان میں موجود سامعین کو اس انتہا پسندی کو قریب سے دکھانے کا کام کیا۔ برطانیہ میں مقیم پاکستانی میں ایک طرح کی انتہا پسندی تھی جس سے پاکستانی سامعین نا آشنا تھے۔لیکن اس نے پاکستان سے باہر غیر منصفانہ ضبط کے دکھ پر زور صرف کیا۔اس کی وجہ اس کا مذمتی انداز تھا جو اس نے غیر پاکستانی جارحیت پسند عرب ابوحمزہ المصری سے سیکھا تھا جو برطانیہ میں مقیم تھا۔ جلاوطن پاکستانی، پاکستان میں موجود مسلمانوں کو اس انتہا پسندی کی طرف جھکانے کے قابل تھا جس سے وہ پہلے واقف نہیں تھے۔ایسا ایک چینل حکومت نے بھی سرکاری طور پر قائم کیا جو پرائیویٹ ٹی وی چینلز کے منفی طریقوں کا مقابلہ کر سکے اور برطانیہ میں مقیم پاکستانی طبقے میں انتہا پسندی کے لیے جگہ پیدا کر سکے اور اس کے ساتھ ان کے وطن میں واپس ان کے گھروں میں بھی اس کی جگہ بن سکے۔ لندن سٹوڈیوز میں میزبانوں نے برطانیہ میں مقیم مسلمانوں کی ضمانت دینے کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے یا جب وہ عراق میں جنگ جیسے مسائل پر گفتگو کر رہے تھے یا جب وہ یورپ میں گستاخانہ کارٹونوں اور خاکوں پر بحث کر رہے ہوتے تھے، محسوس کیا کہ ان پر غیر طرف دار ہونے کی وجہ سے کوئی بار نہیں۔ پاکستان میں دکھائے جانے پر یہ تمام تر گفتگو ان کاوشوں کی حوصلہ شکنی ہوتی تھی جو پاکستان میں مذہب کو معتدل کرنے کے سلسلے میں کی جاتی تھیں۔

معتدل مبصرین کی کمی

خالد احمد

ٹی وی چینلز ان لوگوں کو موزوں سمجھتے ہیں جو اسلام پر گفتگو کر سکیں۔ انہیں یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ علما کے علاوہ دیگر مبصرین ڈھونڈنا آسان کام نہیں۔ ضیا کے جبری دورِ حکومت کے بعد اور 9/11 سے پہلے جنرل پرویز مشرف کے دورِ حکومت میں پاکستانی دانش ور طبقہ تیزی سے غائب ہو رہا تھا۔ انتہا پسندانہ نقطہ نظر کی مبالغہ آمیزی نیٹ ورکس پر عیاں ہوتی جا رہی تھی۔ معتدل سوچ رکھنے والے جسٹس جاوید اقبال کا ٹاکرا جب ایک سخت گیر سوچ کے حامل ملا سے ہوا تو اسے ابلاغ کی پابندی کے تحفے کے ساتھ ساتھ کئی قسم کی جزوی معذوریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

پی پی پی کا سابق وزیرِ قانون اور انسانی حقوق کا فعال کارکن اقبال حیدر بہت مؤثر ثابت ہوا لیکن انتہا پسند مبصرین نے اسے خوب لعنت ملامت کی۔ آغا خان یونیورسٹی کا ڈاکٹر حسین جعفری اپنے شیعہ پس منظر اور برموقع صحیح عقیدہ مذہبی ملاؤں کی جارحیت کا مقابلہ کرنے کی عدم صلاحیت کی وجہ سے ان کا مناسب سامنا نہ کر سکتا تھا۔ ڈاکٹر مبارک علی کو اس یکطرفہ اظہارِ خیال کو متوازن رکھنے کے لیے بلایا گیا لیکن اس کے ابتدائی اکھڑ پن اور رد کرنے کے عزم نے غلط اثرات مرتب کیے۔ پروفیسر مہدی حسن نے ان کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور اپنے کام کو جاری رکھا۔ پروفیسر منظور احمد نے ٹی وی مباحث میں اسلام کا ایک معقول نکتہ پیش کیا لیکن دیگر غیر مذہبی سر برآوردہ لوگوں کی طرح اس میں شدت پسندوں جیسی شدت نہیں تھی۔ ایک اور پُر ترغیب اور معتدل سوچ کا حامل مبصر ڈاکٹر فاروق احمد خان بھی ہے۔ لیکن وہ شاذ نظر آتا ہے۔ بالآخر ٹی وی چینلز کو جاوید احمد

غامدی کی صورت میں ایسا شخص ملا جس میں متوازن عنصر تھا۔ جاوید غامدی نے 1990ء میں جہاد کو بغیر ریاست کی اجازت کے قبول نہیں کیا تھا۔ یہ جہاد کا ابتدائی مرحلہ اور دورانیہ تھا۔ غامدی نے مشرف کے مجازی کردار کا اچھا استعمال کیا اور جارحیت پسندوں کو ٹھونک بجا کر جواب دیا۔ وہ کسی قسم کے نقصان سے دوچار نہ ہوا، جس کا شکار پہلے معتدل اور متوازن لوگ ہو چکے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اعتدال پسند فوری طور پر قرآنی حوالہ جات، آیات اور احادیث کے حوالے دینے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ غامدی کی وجہ سے ناظرین کی بڑھتی ہوئی تعداد مختلف نقطہ ہائے نظر سے آشنا ہوئی، جو تشدد کا جواز بنتے تھے۔ اعتدال پسندی کا اکیلا وکیل ہونے کے ضرر کو متوازن کرنے کے لیے مختلف ٹی وی چینلز پر اس کا آنا جانا ایک کوشش اور کاوش بن گیا۔ اگرچہ اسی کی لائن کا ایک اور نیا مبصر لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز کا خالد ظہیر بھی ہو سکتا تھا لیکن وہ شرکت کے لیے وقت نہیں لے سکتا ہے۔

ٹی وی چینلز کے میکانی مفاد کی اسلامائزیشن کو سب سے بڑی مدد پاکستان میں سیاسی مکالمے کے غیر دانشورانہ رویوں سے ملی، جو مشرف کی طرف سے امریکہ کی مجازی غلامی کی مخالفت کی صورت میں تھی۔ پرویز مشرف کے دلائل کے معیار کو نظرانداز کر کے بڑی سیاسی پارٹیوں کو مخالفت کرنا تھی۔ وہ جو کچھ بھی کر رہا تھا انہیں ان پالیسیوں کو بشمول ڈی اسلامائزیشن کی پالیسی روشن خیالی کے نام پر انفرادی طور پر رد و قبول کرنے میں نقصان نظر آیا۔ ایسی سیاسی پارٹی جسے اس بنیاد پر سب سے زیادہ نقصان ہوا وہ پی پی پی تھی، جس کا خیال تھا کہ رائے دہندگان پرویز مشرف کو یکسر رد کر دیں گے۔ پی پی پی کے رہنماؤں نے پاکستان مسلم لیگ نواز (PMLN) کے ان لوگوں کو شامل کیا جن کا جھکاؤ مذہبی لوگوں یا مولویوں کی طرف تھا، اور مشرف کے تمام منصوبوں کو معطل کر دیا۔ اگرچہ ان منصوبوں میں پی پی پی کے لبرل ازم کا زیادہ عکس تھا۔ عوامی حلقوں میں ابتدائی ووٹنگ کا ذہن میں رکھ کر اور اپنے وجود کو غیر دانشورانہ کر کے پی پی پی خود کو تباہ کر چکی ہے۔ ٹی وی پر بار بار پی پی پی اور PMLN کے رہنما اسلام پر گفتگو کرتے رہے لیکن کسی نے شدت پسندانہ پہلوؤں کی مخالفت نہیں کی جس کی مولوی حمایت کرتے تھے۔ اس کی سادہ سی وجہ یہی تھی کہ مشرف اس سے شرمندہ ہوتا تھا۔ سیاسی پارٹیوں کے امریکہ مخالف جذبے بھی انہیں ٹی وی پر شدت پسندوں کی طرف جھکنے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ الیکٹرانک میڈیا کے اسلامیاتی وظیفے کا مرکب ہے۔

علمااوران کی یک زبانی کا فائدہ

خالد احمد

ٹی وی پر مذہبی اظہارِ خیال کے تسلط کے پیچھے ایک واضح عنصر رابطے اور دوسروں تک بات پہنچانے کی اہلیت بھی ہے۔ ماضی کی نسبت اب ٹی وی چینلز پر زیادہ زور علما کو ان کے دہرے کردار یعنی ریاستی نظریے کے قاضی ہونے اور سیاسی اسلام کے نمائندے ہونے کی وجہ سے لانے پر دیا جاتا ہے۔ ایک مولوی جس کا تعلق مذہبی اتحاد MMA سے ہے وہ پارلیمانی حزبِ اختلاف کا کام کر رہا ہے۔ اسے حکومت کی سیاسی اور معاشی پالیسیوں کے ساتھ ساتھ ایمان اور شریعت کے مسائل پر بھی گفتگو کی دعوت دی جاسکتی ہے۔ ان تمام معاملات میں مولوی کی اردو زبان بولنے کی صلاحیت اسے غیر مولوی مبصر پر فوقیت اور برتری دیتی ہے کہ وہ آسانی سے اپنی بات کی ترسیل کرسکتا ہے۔ زیادہ تر غیر مولوی مبصر اردو اور انگریزی کو ملا کر بات کرتے ہیں جس سے ان کی گفتگو کا اثر چھن جاتا ہے۔ یہ بات اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب ایک غیر مذہبی معتدل مزاج شخص شدت پسند MMA کے خارجی پالیسی اور ملک میں سماجی تبدیلی کے نقطہ نظر پر بات کرتا اور مقابلہ کرتا ہے۔ (جاوید احمد غامدی ٹی وی کی مشہور اور مقبول شخصیت کے طور پر سامنے آیا ہے اور مذہبی شدت پسند مولویوں کے مدّ مقابل بہت مؤثر ثابت ہوا ہے۔ اس کی ایک وجہ اس کی صاف شفاف اردو میں گفتگو ہے۔) سیاستدان اپنے اس روپ اور کمزوری سے ذرا بھی پریشان نہیں ہیں۔ ٹی وی چینلز نے گفتگو کے اس نقص کو ایک طرح سے سکون اور آرام کے طور پر پیش کیا۔ خالص اور ہر قسم کی آلائش سے پاک تقریر کی ترغیب کا سائنسی انداز میں جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ لیکن

پاکستان کے لوگوں کے درمیان رجعت پسندانہ ورلڈ ویو کا عروج اور غیر مذہبی سیاستدانوں کی قدر اور قابلیت میں زوال کو اس بات سے متصف کیا جا سکتا ہے۔

اظہارِ خیال کی آزادی اور پرائیویٹ ٹی وی چینلز کا خالص مذہبی نظریات اور سمجھ بوجھ کو مدد دینے اور پاکستان کے مذہبی اظہارِ خیال کو ٹھوس بنیادوں اور بنیاد پرستانہ کرنے کے لیے ملاپ ہو چکا ہے۔ مباحثہ کا جھکاؤ مذہبی مولویوں کی طرف ہے۔ اس کی وجوہ اوپر بیان کر دی گئی ہیں۔ آج سے پہلے لوگ مذہب اور نظریاتی مسائل سے اتنے آگاہ نہیں تھے لیکن یہ آگاہی بہت حد تک پرانے، غیر تشریحی اور فرقہ ورانہ اسلام کے حق میں ہے۔ اس نے ذہن کو ایسا جھکاؤ اور اس طرح موڑ دیا ہے جو کم سے کم اپنی اصلاح قبول کرتا ہے۔ 9/11 کے بعد ریاستِ پاکستان اصلاح کی کوشش کر رہی ہے، جو کسی حد تک جہادی حکمتِ عملی کا تباہ کن عروج تھا اور فوج کا ملک پر مسلط کردہ تھا۔ میڈیا کو جس دانش سے آزادی ملی اس کا قائل ہوں لیکن حکومت کا مارکیٹ کے ہانکے ہوئے مظہر سے سامنا ہے، جس سے وہ نہیں لڑ سکتی۔ یہ بدقسمتی پاکستان میں سیاسی تبادلہ خیال کے فن سے طویل عرصے تک عدم آگاہی کا نتیجہ ہے۔ ایک اور وجہ سیاستدانوں اور دانشوروں کے تبادلہ خیال کے دستیاب ذرائع کو نظر انداز کرنے کا بھی ہے جو مذہبی مولویوں کو دستیاب ہیں کہ وہ روز ایک ہی زبان میں خطبے دیتے ہیں۔

ریاستی جواز کو چیلنج

خالد احمد

نئے مذہبی اظہارِ خیال کا بہت واضح انجام ریاستی جواز کی کمزوری ہے جس کے پیچھے نظریاتی پاکیزگی کی آرزو ہے۔ لوگوں کے ذہن میں ہلکا سا ریاستی عدم جواز ہے جسے ٹی وی چینلز پر بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اس کا ہدف معاشرے کے اوپر کے درجے کے، درمیانے درجے کے اور نچلے درجے کے لوگ ہیں لیکن جو باتیں میڈیا کی رسائی سے باہر ہیں وہ یہ ہیں کہ یہ صرف مسجد کے ملاؤں سے روابط قائم کر رہے ہیں۔ کوئی شخص بھی کہہ سکتا تھا کہ آج ٹی وی کسی حد تک شہری آبادی کے گھروں سے مسجد تک مذہبی اظہار خیال پیش کرتا ہے۔ اس کی اہمیت بلاشک افرادی ہے لیکن آزادی کی وجہ سے اپنی بنیاد پرستانہ شدت کی بنا پر پُر تاثیر بھی ہے۔ باغیوں کے طریقہ ہائے کار بغیر کسی چیلنج کے ٹی وی پر اکثر دکھائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر اکثر سیاسی اور مدارس کے علما پاکستانی معیشت کا حوالہ دیتے ہیں کہ یہ حرام ہے کیونکہ اس میں سود کا لین دین اور عمل دخل ہے۔ پاکستان کے جوڈیشل نظام کو چیلنج کیا جاتا ہے کیونکہ اس میں مکمل طور پر شرعی اصلاحات نہیں ہیں۔ اور جہاں شامل ہیں وہاں ان کا نفاذ نہیں ہے۔ مذہبی ملاؤں نے ہمیشہ شامل سیاسی شریعت کو بھی چیلنج کیا ہے اور زیادہ ظاہر شریعت کو اس سے بدلنا مناسب سمجھتے ہیں جس میں ہاتھ کاٹنا، زانیوں کو سنگسار کر کے موت کے گھاٹ اتارنا، اور یہ کام عدالت کے ذریعے چاہتے ہیں جن کے منصف مولوی ہوں۔ خارجہ پالیسی کے میدان میں اس ابھرتے ہوئے مذہبی اظہارِ خیال سے بہت نقصان ہوا ہے جس نے ملاؤں کو ریاستی ذمہ داری کا حصہ بننے کا راستہ دیا ہے جہاں بہت لچک کے لیے وسیع جگہ ہونی چاہیے۔ دفاع کے معاملات میں جنگ کے مذہب پرستانہ شعار بطور شریعت

کے سچے راستے کے اختیار کیے جاتے ہیں، منصفانہ جنگ کی تصدیق ہوتی ہے کیونکہ دنیا کے کچھ حصوں میں مسلمان پسے ہوئے ہیں یالا مذہب ریاستوں کے ہاتھوں شکست کھائے ہوئے ہیں۔ پاکستان کا نیوکلیئر پروگرام فوری قابل استعمال آپشن ہےاورشہادت کے اصول (جس میں قرآن کے مطابق شہید جسمانی طور پر زندہ رہتا ہے) کو پاکستانی شہری آبادی کومحفوظ رکھنے کے لیے شہادت کا اصول استعمال اور نافذ کیا جاسکتا ہے۔اس ہتھیار کو پاکستان کی پڑوسی ریاستوں پرآزمایا جاسکتا ہے۔نیوکلیئر بم تک رسائی کئی طرح سے آسان ہے۔اس نقطۂ نظر کے مطابق جوملاؤں نے لوگوں میں پاکستان کے فارن ایکسچینج ذخائر کے تبادلے کے حوالے سے پھیلایا ہوا ہے،غریبوں کے درمیان ان کے فوری خرچ کی ادائیگی اس بات کوراسخ کرے گی کہ ریاست امراءاوراشرافیہ کے بجائے غریبوں کا خیال رکھتی ہے۔ پاکستان کے ٹی وی چینلز بہت پہلے یہ بات راسخ کر چکے ہیں کہ جہاد ایک نجی معاملہ ہے اور ریاست سے اس کی اجازت کی ضرورت نہیں۔نجی طور پر عسکریت پسندوں کے دھڑوں کی مولویوں کی رہنمائی سے یہ اصول کہ جہادنجی معاملہ ہے پڑوسی ملکوں میں بھی خفیہ طور پرسرایت کر چکا ہے۔غامدی جیسے معتدل مزاج اسلامی عالم اس معاملے میں عام مولویوں سے ہاری ہوئی جنگ لڑ رہے ہیں۔ پرائیویٹ ٹی وی چینلز اپنی پروگرامنگ تکنیک میں چندایک تبدیلیاں پاکستان کوایک ایسا ملک مشتہرکرنے سے بچنے کے لیے کرسکتے تھے کہ یہ ملک اپنی اصلاح نہیں کرسکتا حتیٰ کہ اقوامِ متحدہ کی سکیورٹی کونسل کی قرارداد1373 کے تحت بھی درستی ممکن ہو سکتی تھی کہ اس ملک کی بیس سالہ جہادی شدت پسندی بےٹھکانہ اورغلط استعمال کی گئی حتیٰ کہ وہ ٹی وی چینلز بھی جواسلامی طرف داری کی بناپرقائم ہوئے انہیں اس ضرورت کومحسوس کرنا چاہیے کہ وہ اس تباہ کاری اور نقصان کی درستی کریں جس کی وہ آخری حد تک حمایت اور رخصت دے چکے ہیں۔سب سے پہلے میزبان کا اس ابتدائی تربیت سے دست کش ہونا کہ اسے حداعتدال سے بھی زیادہ مذہبی شخصیات کا احترام کرنا چاہیے۔ایک غیرواضع وغیرعلانیہ ذمہ داری کی بناپر بات کرتے ہوئے میزبان کو اپنے غیر مذہبی مبصر کو ذلیل کرنے سے باز رہنا چاہیے۔چینلز کو غیر جانبدار میزبانوں کا انتخاب کرنا چاہیے۔میزبان غیر جانبدارانہ پروگرام کرنے کے قابل ہوں اورعوام کو اپنا نقطۂ نظر قائم کرنے کی اجازت ہواوروہ تمام جزیات جوغیر مذہبی مبصر کے خلاف ہوں ڈائس سے ہٹادینی چاہئیں اوران کے لیے فضا ہموار ہونی چاہیے۔خاص طور پرسامعین کا انتخاب احتیاط سے کرنا ضروری ہے تاکہ یکطرفہ سنوکر میچ کی طرح ذلالت کا مقابلہ نہ بن جائے۔

جمہوریت اور میڈیا: توازن کی نئی اخلاقیات کی ضرورت

خالد احمد

1947ء میں پاکستان کی تخلیق کے بعد اسے وہی مسائل درپیش تھے جو تاریخ میں نوزائیدہ آزاد ریاست کو ہوتے ہیں۔ ان میں سے دو مسائل فنڈز کا فقدان اور انڈیا کی مخالفت تھے جو بعد میں نیشنل ازم کا حصہ بن گئے اور اس کی تکلیف دہ تخلیق کی شعوری آگاہی بھی اس کا حصہ بن گئی۔ اس شعوری آگاہی کا اہم ترین حصہ کشمیر پر انڈیا کی جنگ تھی جس نے پاکستانی نیشنل ازم کی فطرت ابتدائی مرحلے پر طے کر دی۔ پاکستان کے ناگفتہ مقصدی بیان نظریاتی خواہش کی بنیاد بن گئے۔ انڈیا کی کشمیر کے جوڑ توڑ کی ناانصافی کی صورتِ حال اور اس کی بار بار منصفانہ جنگ کے دعووں نے بھی پاکستانی نیشنل ازم کی بنیاد میں اہم کردار ادا کیا۔

دوسری ریاستوں کی طرح پاکستان میں نیشنل ازم نے نظریاتی ریاست کی فطرت کو طے کر دیا۔ قوم پرستی سے متعلق تمام کلاسیکی خدوخال موجود تھے۔ انڈیا کو ہم نے پکا دشمن سمجھ لیا کہ جس کی بقا اور ترقی کا مطلب پاکستان کی بقا اور ترقی کا خاتمہ ہے کیونکہ انڈیا پاکستان کے ساتھ کوئی مفاہمت نہیں چاہتا تھا۔ اس طرح بیرونی دشمن کو استعمال کر کے کئی قومیتوں پر مشتمل پاکستان کی قوم پرستی کو پختہ کر دیا۔ پہلے پچیس برسوں میں ہم نے جو دفاع پر خرچ کیا اسے دیکھ کر کوئی بھی شخص کہہ سکتا ہے کہ اس نظریاتی اصول نے قوم پرستی کے ساتھ ساتھ پاکستانی فوج پر بھی خاص اہمیت دے کر سرمایہ کاری کی۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ بالادست ادارے کا روپ اختیار کر گیا جو بعد میں جھگڑالو اور نزاعی بن جاتا ہے۔

پاکستانی نظریہ پسندی نے فوج پر بھاری ذمہ داری ڈال دی اور آنے والے برسوں کے لیے اس کے خدوخال مرتب کر دیے۔ اس کا مقصود صرف پاکستان سے کئی گنا بڑی ریاست کو للکارنا تھا۔

ایسی ریاست جس کے خلاف لڑ کر پاکستان جنگ نہیں جیت سکتا تھا۔ بنیادی عدم مساوات کی یہ وجوہ ایک فوج کی حکمتِ عملی طے کرتی ہیں۔فوج نے اس حکمتِ عملی کو انڈین آرمی کو دیگر طریقوں سے للکارنے کے قابل کرنے کے لیے ضائع کر دیا، جس کے نتیجے میں پاکستانی فوج ایک شاطر ادارہ بن گیا جس کے افسر دانش کے بجائے نمود و نمائش کے قائل ہو گئے۔ خاص طور پر جہاد کے اسلامی تصور کے حوالے سے، جس کا انحصار عقیدے پر ہے نہ کہ متعلقہ فوجی قوت پر۔ اس ادارے نے انڈیا کے ساتھ پاکستان کی نظریاتی بنیادوں پر ان نتائج کے ساتھ کہ جن کی گول مول تشریح فتوحات کے طور پر ہو سکے، مناسب طریقے سے پُر امن جنگیں لڑیں۔

سرد جنگ کے عرصے نے پاکستان کی مدد کی کہ وہ قوم پرستی کے ساتھ وابستگی جاری رکھے، جس کا مطلب فوج کو اقتدارِ اعلیٰ بھی دلوانا تھا۔ پاکستانی فوج نے جب ضرورت محسوس کی ملک پر قبضہ کیا، اس ضرورت کے تحت کہ وہ عام شہری رہنماؤں کو یاد دلائیں کہ انہوں نے قوم پرستی سے انحراف کیا ہے۔ جب بھی انہوں نے ملک پر تسلط قائم کیا اس نے اپنی شاطرانہ فطرت کے مطابق بنیاد پر ہاتھ ڈالا اور انڈیا کے ساتھ جنگ چھیڑ دی۔ مشرقی پاکستان کے سقوط کے بعد پاکستان کو اپنی نظریاتی سوچ سے باہر آ جانا چاہیے تھا، اس کے بجائے اس نے مذہبی جنگ کی حوصلہ افزائی کی۔ سویلین حکومت کے تحت فوج نے ایک بار پھر انتقام کی خاطر اس وجدان کے تحت طاقت پکڑنا شروع کر دی۔ بیرونی دشمن کی بنیاد پر قوم کو یکجا رکھنے کا قومی اسطورہ زوال پذیر ہونا شروع ہو گیا۔ انڈیا کی دھمکی پر بہت زیادہ توجہ کی وجہ سے پاکستان میں موجود طبقے، جو مشکل میں گرفتار ہو چکے تھے، انہوں نے سویلین قانون کو چیلنج کرنا شروع کر دیا۔

پاکستانی نیشنل ازم کا ایک دوسرا پہلو اس کا مبنی بر اسلام نظریہ ہے جسے پاکستان کو انڈیا سے مختلف کرنے اور انڈیا میں دوبارہ شامل ہونے سے بچانے کی خواہش کے تحت بہت آگے بڑھایا گیا۔ ریاست اور عبادت گاہ میں عدم تفاوت کے اصول کی بنیاد پر اسلامی انتظام ابتدائی دانش ورانہ چیلنج بن گیا اور اسے تخلیقی سطح پر ازسرِ نو تشریحی طور پر سلجھایا نہ جا سکا۔ فوج، جو قومی جنگوں میں قبائلی لشکر یا غیر ریاستی عناصر کو استعمال کرنے کی عادی تھی، نے مذہبی عنصر کو شامل کر کے پاکستانی نیشنل ازم پر منضبط کرنا شروع کر دیا۔ یہ سرحد کی محافظ اور نظریہ بھی بن گیا۔ یہ بات مکمل طور پر 1947ء کے بعد کے مسلمان کا مخصوص مزاج بن گئی۔ مشرقی پاکستان میں 1972ء کی جنگ کے بعد پاکستانی فوج نے سنجیدگی سے غیر ریاستی عناصر کو کئی ضربوں سے موت کے شاطرانہ فلسفے میں ڈھالنے کے تصور کا آغاز کر دیا، اس گمان پر کہ انڈیا پہلے ہی سے ٹکڑے ہونے کے مراحل میں ہے۔

جہاد اور سرکش علاقوں کی تخلیق

خالد احمد

قومی جنگ میں ریاست کی بالا دستی اور اس کے تشدد کی اجارہ داری کے لیے جہاد کے آغاز کے اپنے نتائج تھے۔ جہادی لشکروں کی تشکیل اور ان کی فوجی تربیت کے بعد سویلین معاشرے میں ان کے مقام نے پاکستان میں کئی قسم کے طاقتی مراکز کی تخلیق کا رجحان پیدا کیا۔ اس نئی اور عجیب و غریب تخلیق کی وجہ سے پہلی بار پاکستانی فوج کی وفاداری میں دراڑیں ظاہر ہوئیں۔ پہلی بار سوویت یونین کے خلاف افغانستان میں جنگ کے دوران مجاہدین کے حق میں اُلٹے عقائد فوج کے دیکھے گئے۔ استعمال کنندہ ریاستی دباؤ کے باوجود کامیاب ٹھہرے۔ سب سے پہلے کیا ہو: پاکستان یا اسلام؟ 1990ء تک مباحث میں نظر آتا ہے کہ زیادہ تر پاکستانیوں کا جھکاؤ اس بات کی طرف تھا کہ وہ پہلے مسلمان ہیں بعد میں پاکستانی ہیں۔ مدارس، جو جہاد کی نرسریاں تھے اور عام آدمی کے رہنما دانشمند تھے، ان کی افزائش کو ٹی وی چینلز نے ریاست کے زیرِ سایہ پاکستان کی تسلیم شدہ قدر کے طور پر پیش کرنا شروع کر دیا۔

مملکتِ پاکستان کی حدود میں کچھ سرکش اور منہ زور علاقے تھے۔ یہ وہی علاقے ہیں جہاں سے 1947ء، 1965ء اور 1999ء میں انڈیا کے خلاف جنگ میں غیر ریاستی عناصر آئے تھے۔ بحث یہ ہے کہ آیا ان علاقوں کو ضم کرنا اور قبائلیوں کی زندگی کے روایتی طریقوں کو محفوظ کرنا عوامی خواہش اور دباؤ تھا یا غیر ریاستی عناصر کو حاصل کرنے کی فوجی خواہش تھی۔ اگر چہ افغان جنگ کے بعد، جس میں پاکستان نے امریکہ اور اس کے اتحادیوں کا بھرپور ساتھ دیا اور کئی منہ زور اور سرکش

علاقوں کو خود میں شامل کر لیا اور انہیں آباد علاقے گردانا، مجاہدین لشکروں کی مدد سے مدارس قائم ہوئے جنہوں نے پاکستانی بالادستی میں خوب حصہ لیا۔ انہیں طاقت کے دیگر مراکز سے خوب فائدہ ہوا، جن کی یہ مدارس نمائندگی کرتے تھے۔ فوجی افسر کی تابعداری تقسیم ہونے لگی۔ اس نے اسلامی جنگجو سے زیادہ وفاداری دکھانا شروع کر دی کیونکہ وہ فوج کے بجائے اس کے ساتھ کام کر رہا تھا۔

2001ء میں سرکش اور منہ زور علاقے جہادی قوت کے گڑھ کے طور پر سامنے آئے تو دوسرا عمل شروع ہوا یعنی پاکستان کے انتظامی علاقوں کی قبائلی تقسیم اور صوبوں کا ریاستی انتظام سے دست کش ہونا۔ فاٹا اور پاٹا میں یہ نیا رجحان شریعت کے لیے اسلامی تقاضے کا روپ اختیار کر گیا جس نے پاکستانی آئین کو چیلنج کر دیا اور وفاقی شرعی عدالت کے ذریعے اس کے نفاذ کو بھی چیلنج کر دیا۔ جہادی شریعت کی بنیاد معروفات پر تھی جس میں نہ صرف قانون میں بلکہ منکرات پر سزا بھی شامل ہے، جو آئین میں موجود ہے۔ 2005ء تک تمام جہادی مذہبی اور غیر جہادی حصہ بھی معروفات کے نفاذ پر یقین رکھتا تھا۔ اس طرح اس نے بالواسطہ آئین کو رد کر دیا۔ پاکستان کے قبائلی علاقے بھی خودکش حملوں اور بمباری کے لیے عیاں ہو گئے اور وہ مختلف شہروں میں منتقل ہو گئے۔ صوبہ سرحد کے ہاتھوں نہ صرف مالاکنڈ کا حصہ بلکہ کئی دیگر شہر، جو پشاور سے باہر تھے، نکل کر طالبان کے ہاتھوں میں چلے گئے۔ ان میں کوہاٹ اور بنوں میں موجود اہم ترین ملٹری بیس بھی شامل ہیں جن پر طالبان کا قبضہ تھا۔

اپنے خاص قسم کے مسائل کے ساتھ جنہوں نے پاکستان کو بطور ریاست تیسری دنیا سے جدا کر دیا وہ دو قسم کے رجحانات تھے۔ ایک اس کا سرکش علاقوں تک خود کو پھیلانا اور دوسرا اس کا نیوکلیائی ہتھیار حاصل کرنا۔ یہ دونوں عناصر ریاستی بالادستی کے نقصان پر واقعاتی طور پر جہاد کی فضا کے حق میں تھے کیونکہ جہاد غیر ریاستی عمل کنندگان نے کرنا تھا۔ نیوکلیئر ہتھیاروں کا حصول پاکستان جیسی صحیح عقیدہ ریاست بمقابلہ انڈیا کے لیے موزوں ترین تھا جس نے چین کے مقابلے میں خود کو صحیح عقیدہ ریاست ہونے کا اعلان کیا۔ (انڈیا نے چین کو چیلنج کیوں نہ کیا جو اس سے کئی گنا طاقتور تھا، انڈیا کی قوم پرستی کی فطرت کی وجہ سے اور ریاست میں فوجی تسلط نہ ہونے کی وجہ سے) پاکستان کی مناسب جنگی حکمتِ عملی اب نیوکلیئر چھتری کے نیچے شروع کی جا سکتی تھی۔ تشدد اور چڑھائی کا مناسب حل نہ نکلنے پر اور دونوں کے نیوکلیائی طاقت ہونے کے بعد بھارت نے اب پاکستان کے محدود جنگ کے تصور کے تحت پاکستان کا سامنا کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

نیشنل سکیورٹی کے لیے انتظامی قربانی

خالد احمد

جب ریاست کی بیرونی بالا دستی محض اسطورہ ہے، کوئی ریاست اندرونی بالا دستی کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی ہے۔ بیسویں صدی کے عالمی آرڈر کا حصہ بننے اور اس کے مضبوط ہونے سے پہلے ریاست کی موجودگی کا معیار صرف اس کی رٹ تھی یعنی حکومتی انتظام کی اس علاقے میں اہلیت بشمول ٹیکس اور امن و امان کے، جس کی ملکیت کا دعویٰ ریاست کو ہوتا ہے۔ ریاست کا جہاد کو اختیار کرنا براہِ راست ریاستی رٹ سے محروم ہونے میں معاونت کرنا تھا۔ رٹ سے محرومی پہلے بلوچستان اور قبائلی علاقوں سے شروع ہوئی اور شہروں میں نو گو ایریاز کی صورت میں پھیل گئی۔ بلوچستان بطور صوبہ کئی مسائل کا شکار ہوا تو اس کی کئی وجوہ تھیں۔ ایک وجہ پاکستان کی مشرقی سرحد پر سکیورٹی دلچسپیوں کی وجہ سے بہت توجہ مرکوز تھی۔ بلوچستان کے لیے اس کی دلچسپی صرف وہاں فوج اور ایف سی کی موجودگی کی حد تک تھی۔ بلوچستان میں سیاسی اجماع آج فوج، پولیس اور ایف سی کی موجودگی کے خلاف ہے جو وفاق کے حدود سے بہت آگے کی بات بن چکا ہے۔ جب انڈیا نے پاکستان کے ساتھ محدود جنگ کے حق میں سوچا تو اس نے بلوچستان میں سرگرم ہونے کا فیصلہ کیا۔

حکومتی انتظام کا انحصار ریاست کی رٹ پر ہے جو انتظام کو پہلے درجے پہ رکھتی ہے۔ ریاستی رٹ کے بغیر خطوں میں انتظام یا ایسی رٹ جس میں غیر ریاستی لوگ شامل ہوں ادھوری تصور ہوتی ہے۔ قبائلی علاقوں اور مالاکنڈ میں دو برس تک وہاں کا مقامی انتظامی ڈھانچہ ریاستی قابو میں نہیں

تھا۔ وہاں کوئی امن نہیں تھا۔ وہاں لوگ ریاستِ پاکستان کے ساتھ وفاداری کا اعلان کر کے زندہ رہ سکتے تھے۔ بلوچستان میں اب بنیادی اساس کو بھی چیلنج درپیش ہے۔ وہاں وفاقی اثاثے غیر محفوظ ہیں باوجود اس کے کہ وہاں فوج اور پارلیمانی متعلقات ہیں۔ کوئٹہ سے اور کچھ دیگر شہروں سے باہر پولیس کا کوئی وجود نہیں۔ اگر وجود ہے بھی تو اسے بھی لیویز کی وجہ سے چیلنج کا سامنا ہے، جس کی بلوچ حمایت کرتے ہیں۔ پرائیویٹ فوج کا وہاں رواج ہے۔ وہاں صرف ایک قانون کام کرتا ہے اور وہ ہے مزاحمت، خوف اور دہشت کا۔ اگر آپ بلوچستان، فاٹا، پاٹا بمع دیگر شہروں جنوبی پنجاب میں تشکیل پاتی ریاست سمیت سندھ اور کراچی کے نوگو ایریاز کو شامل کریں تو معلوم ہوگا کہ 60 فیصد علاقے بغیر مناسب انتظام کے ہیں یا ایسے علاقے ہیں جہاں ریاستی رٹ کی کمزوری کی وجہ سے انتظام ممکن نہیں۔

ابتدائی سطح پر انتظام کا مطلب امن و امان ہے۔ اس کے بعد ٹیکس وصول کرنے کی باری آتی ہے۔ خاص طور پر وہ ٹیکس جو لوگوں کی آمدنی سے جڑے ہوئے ہیں۔ ٹیکس وصولی بھی حکومت کے بس سے باہر ہے۔ انتظام کے دونوں پہلو پاکستان میں چوتھی صدی سے معدوم ہیں۔ تیسری دنیا کی ریاست ٹیکس وصولی کی وجہ سے خسارے میں ہے۔ کسی حد تک اس کی وجہ مؤثر منتظم اور عدالت پہنچ سے باہر ہونا ہے۔ لیکن پاکستان کے پاس کچھ خصوصیات ہیں جن میں وہ تیسری دنیا کے ممالک کو نہیں بلکہ اپنی خصوصیات میں ناکام یا ناکام ہوتی ریاستوں جیسے صومالیہ اور افغانستان وغیرہ کو شریک کرتا ہے۔ پہلی خصوصیت بڑے شہروں اور دیہاتوں میں امن و امان کا نہ ہونا۔ دوسری خصوصیت جہادی اور دہشت گرد تنظیموں کی مضبوطی کے آگے عدالت اور افسران کی سجدہ ریزی ہے۔ پاکستان کی تیسری فقیدالمثال خصوصیت یہ ہے کہ غیر ملکی دہشت گرد اور پاکستانی غیر ریاستی عناصر پاکستان سے باہر بھی دہشت گردی کرنے کے قابل ہیں اور دوسرے ملکوں مثلاً یورپ اور امریکہ تک دہشت گردانہ کارروائیاں کر سکتے ہیں۔ اس سے عالمی قوانین کے تحت متاثرہ ریاستوں کے حملے کا دروازہ کھلتا ہے۔

پاکستان اب بغاوتوں کا مرکز ہے اور ان بغاوتوں کا مقصد ریاست کے اندر نقشے کی تبدیلی

ہے۔ غیر ریاستی عناصر پاکستان کے باہر سے حملے کا ارادہ رکھتے تھے تاہم اب پاکستان کے اندر سے پاکستان پر ضربیں لگا رہے ہیں۔ ان ریاستوں کی مدد سے جنہیں پاکستان ان عناصر کی مدد سے نشانہ بناتا رہا ہے وہی غیر ریاستی عناصر اب غیر ملکی ہیں۔ لیکن اسلامسٹ ٹیررسٹ گلوبل موومنٹ کا حصہ ہیں جو مغرب میں عمومی طور پر اور امریکہ میں خاص طور پر لڑ رہی ہے۔ پاکستان میں ان کی موجودگی ان علاقوں میں فرض کی جاتی ہے جہاں حکومتی رٹ نہیں ہے۔ وہ پاکستان کے دیگر علاقوں میں بھی موجود ہیں جہاں انٹیلی جنس ایجنسیز ان کی حفاظت کرتی ہیں۔ طالبان کو دو قسموں کے یعنی اچھے اور برے طالبان میں تقسیم کرنے کی پاکستانی پالیسی بہت پیچیدہ ہے۔ طنزیہ طور پر برے طالبان پاکستانی طالبان ہیں۔ پاکستان میں امریکہ مخالف جذبات واضح ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان امریکہ مخالف عسکری عناصر کو روکنے میں خود کو معزور سمجھتا ہے۔

امریکہ مخالف جذبات غیر مفید باتیں بھی ساتھ لائے ہیں۔ امریکہ کی اس خطے میں پالیسی دیگر علاقائی اور غیر علاقائی ریاستوں کی سوچ کی تقلید کرتی ہے جنہیں دہشت گردی کا خطرہ ہے۔ امریکہ مخالف طرز اپنانا پاکستان میں اداروں اور سیاستدانوں کے لیے بہت مفید ہے جو اپنے اپنے علاقوں کو بڑھا رہے ہیں جبکہ پاکستان میں امریکہ مخالفت کو اختیار دینے کا مطلب عالمی سطح پر خود کو تنہا کرنا ہے۔ معاشی انحصاری کے دیئے گئے پیٹرن میں پاکستان اس تنہائی کو بمشکل برداشت کرسکتا ہے۔ توجہ اصل منظر سے اپیل کی طرف جاتی ہے کہ ایک بار پھر نیشنل سکیورٹی کو انڈیا سے خطرہ ہوگا، جو جھوٹ موٹ دھمکی معاشی ناکامی کی گھڑ لے گا۔ سرد جنگ کی فضا نہ ہونے کی وجہ سے انڈیا کی دھمکی پر انحصار کرنا خطرناک دروں بینی ہے کیونکہ پاکستان کے اتحادی بشمول امریکہ کوئی بھی یقین نہیں کرتا ہے۔

کیا انڈیا کی طرف سے ملنے والی دھمکی کی بنا پر اپیل قومی یکجہتی کی تشکیل کرتی ہے، جس طرح ماضی میں ہوا تھا۔ زمینی شہادتیں یہی کہتی ہیں کہ ایسا نہیں ہوگا بلکہ اس سے وہ طاقتیں متحد ہوں گی جو مذہبی عہدیداروں کے خلاف ہیں۔ صوبے، جو نصف صدی سے خودمختاری مانگ رہے ہیں، وہ نیشنل سکیورٹی کے مفاد میں وفاق اور وفاقی ایگزیکٹو پر تنقید روکنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ تاہم طاقت کے مراکز، جو 2007ء میں جنرل پرویز مشرف کو ہٹانے کی کوشش کے دوران منظر پر

تھے، وہ بھارت مخالف اور امریکہ مخالف جذبات استعمال کر کے حملہ کرتے ہیں اور وفاق کو غیر مستحکم کرتے ہیں۔ پاکستانی نیشنل ازم اپنا دورانیہ مکمل کر چکا ہے۔ بلوچستان میں سرکشی اور بغاوت ہے اور دیگر خطوں میں اسے کوئی ردعمل نہیں ملا۔ اس سے تصدیق ہوتی ہے کہ اوپر سے نیشنل سکیورٹی کے تسلط کی وجہ سے پاکستان میں قومیت ناکام ہو چکی ہے۔ میڈیا بعض اوقات اسلام آباد میں مقتدرہ سے مل جاتا ہے، اس بات پر زور دینے کے لیے کہ انڈیا کی طرف ظلم وتشدد کا طور طریقہ برقرار رکھا جائے اور پاکستان کو نیشنل سکیورٹی ریاست فرض کیا جائے۔

پاکستان کے چھ ریاستی ستون

خالد احمد

تمام ریاستوں کے تین باہمی متوازن طاقت کے مراکز یا تین ریاستی ادارے مجلس قانون ساز، انتظامیہ اور عدلیہ ہوتے ہیں۔ جب قوم پرستوں کا مزید دباؤ بڑھا تو ایک چوتھے ستون یعنی فون کا اضافہ ہوا۔ وقت گزرنے کے ساتھ پانچویں ستون یعنی اسٹیبلشمنٹ کا اضافہ ہوا، جو ریاست کے مستقل اداروں پر مشتمل تھا اور فوجی بیوروکریٹک پریشر گروپ تھا۔ سکیورٹی کے از کارِ رفتہ اصولوں نے ریاست کی انٹیلی جنس ایجنسیوں کو تمام اداروں میں پیر شاہی کا درجہ دے دیا۔ آج آئی ایس آئی اسٹیبلشمنٹ کے حکمت عملی طے کرنے والے ذہن کا کردار ادا کرتی ہے جبکہ حد سے زیادہ فعال ہوتی ایم آئی اسٹیبلشمنٹ میں فوجی تسلط پر مہر تصدیق ثبت کرتی ہے۔ دو مزید طاقتی مراکز میڈیا اور جہادی تنظیموں کا ریاستی نظریہ کے ستونوں کے طور پر اضافہ کیا گیا۔ 2009ء میں چھ ستونوں میں سے پانچ ستون مختلف درجوں کی کمی بیشی سے امریکہ اور بھارت کے حق میں تھے۔ ریاست کے قدغنی اقتدار کے جوڑ توڑ میں اس عدم توازن کو دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ اور میڈیا میں مڈ ٹرم الیکشن کی چیخ و پکار میں میڈیا نے مجلس قانون ساز میں حزب اختلاف پر الزام لگایا کہ وہ اس منکر دین حکومت کے لیے نرم گوشہ رکھتی ہے۔

آج ریاست کے موجودہ ستون یہ ہیں:

1-مجلس قانون ساز

2-انتظامیہ

3-عدلیہ
4-فوج+اسٹیبلشمنٹ
5-میڈیا
6-جہادی تنظیمیں

بطور جج اور عوامی رائے کے ذریعے دباؤ پیدا کرنے والے میڈیا نے مشرف کے دور میں طاقت پکڑی۔مشرف نے ٹی وی چینلز کو پھلنے پھولنے کی اجازت دی۔ان کے ذریعے اردو زبان میں بیان کردہ رائے سے دائیں بازو کی طرف جھکاؤ رکھنے والے نظریاتی ستونوں کو مسلط کیا۔ٹی وی اینکرز کی پہلی کھیپ میں اردو کے بہترین کالم نگار شامل تھے۔بعد میں جب ٹی وی چینلز کی افزائش ہوئی تو دوسرے اور تیسرے درجے کے کالم نگار بھی ان میں شامل ہو گئے، جو قوم کے ذہن کو ایک خاص سمت میں موڑ رہے تھے۔اور جنہوں نے بعد کے برسوں میں جہادی تنظیموں کے عروج پکڑنے کو ممکن بنایا۔کیونکہ پاکستانی فوج نے انہیں افغانستان اور کشمیر میں چھوٹے درجے کی جنگوں کے لئے استعمال کیا۔جہادی لشکروں کے عروج پکڑنے سے بعد کے برسوں میں یہ طاقت کے مرکز بن گئے کیونکہ ریاست نے انہیں سول معاشرے میں میل جول کی اجازت دی اور تحفظ بھی دیا۔عدالت بھی چھوٹے شہروں اور قصبوں میں ان کی سجدہ ریزی میں مصروف ہوگئی۔وہاں جہادیوں سے منسلک مدارس چھوٹی عدالتوں پر زور دے کر اپنی مرضی کے فیصلے کرواتے رہے۔کوئی شخص یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ اعلیٰ عدالتیں بھی کئی کیسز میں ان کے ڈر اور دھمکی سے ان کی مطیع تھیں۔

پرویز مشرف کی بے دخلی کی مہم میں تین چیزیں بھی ساتھ آئیں: میڈیا، احتجاج کرتے وکیل اور عدلیہ۔وکلا کی تحریک کو سول معاشرے کی حمایت حاصل تھی۔اس مہم کو علامتی طور پر فوجی حکمرانی کے رد کرنے سے جوڑا گیا۔اور عدلیہ کی سر بلندی کے لیے تحریک چلائی گئی کہ عدلیہ نے ججوں کی ماضی کی اس روایت کو توڑا جس میں جج فوجی تسلط کو تسلیم کر لیتے تھے۔دوسری حمایت کی عالمی سطح پر کوئی جان پہچان نہیں تھی یعنی جو حمایت جہادی تنظیمیں فراہم کر رہی تھیں۔جہادی تنظیمیں پرویز مشرف سے کشمیر کا جہاد روکنے اور القاعدہ عناصر کو روکنے اور ان پر پابندی لگانے کی وجہ سے ناراض تھیں، اور جس کے ساتھ ان کی صف بندی تھی۔متحدہ مجلس عمل جیسی مذہبی سیاسی پارٹیوں نے مسلم لیگ (قائد) سے اتحاد کرنے کے بعد محسوس کیا کہ ان کے ساتھ پرویز مشرف نے دھوکا کیا ہے کہ

اس نے صدر اور آرمی چیف کے دونوں عہدے اپنے پاس رکھے ہیں۔ ایم ایم اے کے ساتھ وابستہ مذہبی پارٹیاں جہادی تنظیموں اور طالبان کے ساتھ صف بستہ تھیں۔ انہوں نے ججوں کے بحالی کی تحریک کی بھرپور حمایت کی تھی۔ ان ججوں کو سپریم کورٹ کے چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری پر اپنی برتری اور بالادستی ظاہر کر کے پرویز مشرف نے انہیں نکال دیا تھا۔

2008ء کے عام انتخابات کے بعد پی پی پی حکومت نے ان ججز کی بحالی میں وقت لیا جنہیں پرویز مشرف نے ہدف بنایا تھا۔ اور اس معاہدے کی خلاف ورزی کی جو اس حوالے سے پی پی پی اور پارلیمانی حزب اختلاف کی سب سے بڑی پارٹی اور پنجاب میں برسر اقتدار جماعت پاکستان مسلم لیگ (ن) کے درمیان ہوا تھا۔ جونہی پاکستان مسلم لیگ (ن) نے اپنی روایتی حریف پارٹی پی پی پی سے فاصلہ بڑھانا شروع کیا اور وکلا نے ججز کی بحالی کے لیے تشہیری مہم شروع کی، اس وقت پی پی پی حکومت کے خلاف میڈیا اور عدلیہ میں مضبوط یکجہتی تشکیل پا گئی۔ 2007ء میں اسلام آباد میں لال مسجد محاصرے میں پرویز مشرف کے مخالفین نے ٹی وی چینلز پر زور دیا کہ وہ مذہبی ملاؤں کے حق میں فیصلہ دیں۔ اس چیز نے لال مسجد کے بارے میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے رویے کو متاثر کیا۔ اس طریقہ سے عدلیہ، میڈیا، وکلا اور پاکستان مسلم لیگ (ن) طالبان، جہادی لشکروں اور القاعدہ کے ساتھ دوستانہ نظر آتے ہیں۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ القاعدہ کی قیادت بہت اعلیٰ سطح پر لال مسجد کے علما کے ساتھ کھڑی تھی۔

پی پی پی حکومت جمہوریت کے چارٹر 2006ء میں کیے گئے عہد کی روشنی میں نئی دہلی کے ساتھ تعلقات معمول پر لانا شروع کر دیئے۔ اس کا آغاز 2008ء کی تجارتی پالیسی سے ہوا، جسے اسٹیبلشمنٹ نے پسند نہ کیا۔ اس بات کا اندازہ بعد میں شائع ہونے والے مضامین سے ہوتا ہے۔ تجارتی پالیسی، جس میں 2010ء تک قابل تجارت اشیا میں اضافہ ہونا تھا، کے تحت لاہور کے قریب سی این جی بسوں کی تیاری کے لیے انڈین فیکٹری بھی قائم ہونا تھی۔ نومبر 2008ء میں پاکستان کے غیر ریاستی عناصر کے ممبئی پر حملے کے بعد حکومت نے آئی ایس آئی کے چیف کو صلاح مشورہ کے لیے انڈیا بھیجنے کی پیشکش بھی کی۔ اور پھر آئی ایس آئی کو وزارت داخلہ کے ماتحت کرنے کی کوشش کی۔ یہ دونوں کام اسٹیبلشمنٹ نے ناکام بنا دیئے۔ جلد ہی صدر آصف علی زرداری نے اعلان کیا اور انڈیا کے خلاف نیوکلیائی حملے میں پہل نہ کرنے کا حلف اٹھایا، اس وجہ سے کہ وہ انڈیا

سے ہرگز خوفزدہ نہیں۔ ان سب باتوں کا مقصد پالیسی تبدیل کرنا تھا۔ لیکن اپنے قابل داد تصورات کی یکسانی لیے ناراض میڈیا نے اس کی مخالفت کی۔

جس طرح اوپر عدلیہ پر جہادی تنظیموں کے اثرات کا مشاہدہ کیا گیا، خاص طور پر اضلاع میں، ریاست کی خفیہ جاری جنگ کا نتیجہ ہے۔ صحافت بھی مختلف اضلاع میں دھمکی، خوف اور دہشت کی شاطرانہ چالوں کے دباؤ میں رہی ہے، جہاں جہادی لشکر بذات خود موجود تھے۔ ایسے اضلاع سے انگریزی پریس کو خبریں نہ مل سکیں کیونکہ وہاں انگریزی لکھنے کی اہلیت رکھنے والے رپورٹر نہیں تھے۔ قصبوں اور دیگر چھوٹے شہروں میں جہادیوں کے اس تسلط پر خاموشی بھی دو دیگر وجوہ کی بنا پر تھی: ایک یہ کہ اردو اخبار اپنے ضلعی نمائندوں کو تنخواہیں نہیں دیتے ہیں۔ وہ اشتہاروں پر انحصار کرنے پر زور دیتے ہیں، جو انہیں ان لوگوں سے ملتے ہیں جن کی خبریں وہ اخبار میں چھاپتے ہیں۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ خوف اور ڈر والے اضلاع میں نمائندے دراصل جہادی لشکروں کی پریس برانچ کے طور پر کام کرتے ہیں۔ اور صرف وہ خبریں چھاپتے ہیں جو جہادیوں کی حمایت میں ہوں۔ ان جہادیوں کے شکار، غیر مسلم اور شیعہ کو ناراض پارٹیاں شمار کرتے ہیں۔

یہ بات میڈیا کی آزادی میں نقب لگا چکی ہے۔ جس طرح اس نے اضلاع میں نچلے درجے کی عدلیہ پر نقب لگائی ہے۔ اگر ٹی وی چینلز، حکومت میں پی پی پی اتحاد پر حملے میں اپنی آزادی استعمال کر سکتے ہیں اسی طرح ان کے کچھ کرنے کی آزادی تب جائز ہوگی اگر وہ جہادی تنظیموں کی سرگرمیوں پر بھی آزادانہ تبصرہ کریں گے۔ زیادہ تر اخباروں نے انہیں دہشت گرد لکھنے کے بجائے عسکریت پسند لکھنا جاری رکھا۔ ان دہشت گرد تنظیموں کو ان کے نام سے پکارنے سے احتراز کیا۔ جب کبھی ان تنظیموں میں سے کسی کی شدید اور پُرتشدد کارروائی کی رپورٹنگ کی تو صرف کالعدم تنظیم کی اصطلاح استعمال کی۔ 18 نومبر 2009ء کو پاکستان انسٹیٹیوٹ فار پیس سٹڈیز (PIPS) کے سیمینار میں پڑھے گئے مضمون میں پاکستان میں میڈیا کی عدم آزادی یا طرف داری پر تحفظات ظاہر کیے گئے۔

بہت سے ماہرین آپ کو یہ بتا سکیں گے کہ اخبار اور ٹی وی چینلز طالبان کو پاکستان میں قصابوں کی طرح ہزروں لوگوں، مردوں، بچوں اور عورتوں کو ذبح کرنے کے باوجود ملک کے لیے یا اس کے لوگوں کے لیے خطرہ نہیں سمجھتے ہیں۔ اور واہیات انداز میں حقوق اور اس حفاظت وامان کا تمسخر

اڑاتے ہیں، جس کی آئین ضمانت دیتا ہے۔ سوات میں ملٹری آپریشن سے چند ماہ پیشتر لاتعداد اخباری خبریں اور ٹی وی ٹاک شوز ملٹری آپریشن کی مخالفت کر رہے تھے یا طالبان کے غیر قانونی اور غیر آئینی مطالبات کو جائز قرار دے رہے تھے۔ جب مالاکنڈ میں طالبان نے سیاسی رٹ مکمل طور پر ختم کر دی اور باقاعدہ سکیورٹی فورسز، عوامی نمائندوں اور عام شہریوں کو ذبح کرنا شروع کر دیا، اس وقت میڈیا میں آوازیں اٹھیں کہ یا تو کسی مفاہمت تک پہنچیں یا طالبان کے ساتھ معاہدہ کریں اور انہیں زیادہ سے زیادہ علاقہ دے دیں۔ نشر ہونے والی اور تحریری خبروں میں طالبان کے حق میں سازگار خبریں تھیں۔ یا تو کوئی ڈر خوف نہیں تھا یا اسٹیبلشمنٹ کا حکم تھا۔ یہ بات افسوس ناک حد تک واضح ہے کہ اسٹیبلشمنٹ میں عناصر اب تک طالبان اور دیگر عسکری انتہا پسندوں کے لیے سازگار میڈیا میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

وہی اخبار جو لاہور کا روزنامہ ہے، خیبر ایجنسی کے جنگی امیر منگل باغ کی جانب سے اسے مشکل پیش آئی تو دوسرے ادارے میں اسے چور کہہ کر پشاور اور ایجنسی میں اس کی تاوان، خراج لینے کی سرگرمیوں کا ذکر کیا۔ اس دہشت گرد جنگی امیر نے پشاور سے اس اخبار کے رپورٹر کو اٹھا لیا اور اسے کئی گھنٹوں تک اپنے قدموں میں لٹائے رکھا۔ اس سے ایڈیٹوریل رائٹر کا نام دریافت کرتا رہا۔ اخبار نے اپنی شکست تسلیم کی اور اس سے معافی مانگی۔ اور اس جنگی امیر اور اس کے آدمیوں کے بارے میں منفی سوچنے کی ممانعت کر دی۔ انگلش لینگوئج ویکلی کے مدیروں کو ایک جہادی تنظیم سے بری طرح معافی مانگنا پڑی، کہ انہوں نے ایک تنقیدی مضمون ''Inside account of Militia'' لکھا تھا۔ اس معافی کا انتظام پنجاب انتظامیہ نے اس وعدے پر کرایا کہ وہ اس قسم کا مواد پھر شائع نہیں کریں گے۔ لاہور میں اسی قسم کا ایک واقعہ ایک انگریزی اخبار میں کارٹون چھپنے کے بعد ہوا، جس میں لال مسجد کے مولوی عبدالعزیز کی بیوی کو تکلیف پہنچی۔ اخبار کو ان جہادیوں کی طرف سے دھمکی ملی جو لال مسجد کے لیے مرنے کو تیار تھے۔

PIPS میں پڑھے گئے مضمون میں ایک اور واقعہ درج ہے، جس سے پاکستان میں خاص قسم کے پریس کی بابت سوچا جاتا ہے۔ ایک مشہور انگریزی اخبار نے طالبان کو عسکریت پسند لکھا۔ پھر ایک دن ایڈیٹر کی بیوی سے کسی نے پوچھا کہ اس کے شوہر کا اخبار طالبان کو دہشت گرد نہیں سمجھتا، اگر دہشت گرد سمجھتا ہے تو انہیں ایسا کیوں نہیں لکھتا؟ اگلے دن اخبار نے طالبان کو دہشت گرد لکھنا

شروع کر دیا۔ اسی ہفتے مالاکنڈ ڈویژن اور شمال مغربی سرحدی صوبے کے رپورٹر نے لاہور آفس میں دہائی دی کہ طالبان نے انہیں قتل کرنے کی دھمکی دی ہے اگر انہوں نے دوبارہ دہشت گرد لکھا۔ اگلے دن طالبان کو دوبارہ عسکریت پسندوں کا امتیاز مل گیا۔

مزید شوریدہ سری دیکھیں۔ اکتوبر 2009ء میں طالبان نے لاہور پریس کلب کو دو خطوط بھیجے۔ ایک خط 12 اکتوبر کو اور دوسرا 14 اکتوبر کو بھیجا۔ ان میں خبردار کیا گیا تھا کہ اگر میڈیا نے انہیں دہشت گرد لکھنا بند نہ کیا تو وہ صحافیوں کے دفتروں اور میڈیا تنظیموں کو اڑا دیں گے۔ فرداً فرداً صحافیوں اور میڈیا تنظیموں کو بھیجی گئی فہرست بہت طویل ہے۔ اس قسم کی دھمکی کی مثال مصنف اور کالم نگار ڈاکٹر عائشہ صدیقہ ہے۔ یہ دھمکی القلم پبلی کیشنز میں شائع ہوئی، جو جیش محمد کی ملکیت تھا۔ ڈاکٹر عائشہ صدیقہ کی سرزنش بہاولپور میں مولانا مسعود اظہر کی طاقت کے بارے میں لکھنے پر کی گئی۔ ادارتی تبصرہ پڑھ کر ڈاکٹر عائشہ صدیقہ نے اسے دھمکی سمجھا اور اپنی حفاظت کے لیے فکرمند ہوئی، جس طرح اس کے دوست فکرمند تھے۔ کیونکہ اس کی مشہور کتاب ''Military Inc.'' کو فوج کے خلاف کڑی تنقید سمجھا گیا۔ قابل غور بات یہ ہے کہ ریاست کے ساتھ ساتھ جہادی تنظیمیں بھی تسلسل سے موجود ہیں۔ نومبر 2009ء میں کالم نگار کامران شفیع کے گھر واہ کینٹ میں آٹومیٹک ہتھیاروں سے فائرنگ کی گئی۔ اس واقعہ کے بعد دہشت گردوں نے اسے فون کیا اور ریاست نے بھی فون کیا۔ وہ دہشت گرد کس کو سمجھتا، اس بات پر پریشان تھا۔

میڈیا میں رائے کی یکسانی کا پیدا ہونا، اصل میں براہ راست عوامی رائے کے استناد پر نقب ہے۔ عوامی رائے کو موڑنے والے اور خود عوامی رائے کے درمیان تبادلہ خیال نے مختلف نقطہ ہائے نظر کو ٹی وی سنسر کرنے کو رواج دیا ہے۔ کالم نگار سلیم صافی نے (6 دسمبر 2009ء) کے کالم میں لکھا کہ ایک ٹی وی کے مباحثے میں اس نے یہ نقطہ نظر اختیار کیا کہ کرزئی افغانستان کا صدر رہے گا کیونکہ امریکیوں کے پاس اس کا کوئی متبادل آدمی موجود نہیں۔ آزمائشی طور پر اشرف غنی اور آغا شیرازی موجود ہیں۔ اس نے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے مزید کہا کہ طالبان اور پاکستان کے پاس بھی دوسرا کوئی متبادل نہیں۔ لیکن بغیر سوچے سمجھے اس کے خلاف پراپیگنڈہ شروع کر دیا گیا۔ صرف اس وقت جب کرزئی کے خلاف غیر پشتون عبداللہ عبداللہ الیکشن میں کھڑا ہوا اس وقت اسلام آباد سے یہ خبر جاری ہوئی کہ کرزئی پاکستانی کے لیے بہترین آپشن ہے۔ ٹی وی اینکر کو اس کی

یہ بات پسند نہ آئی اور ایڈٹ کرتے ہوئے اس نے یہ بات نکال دی۔

جب عوامی رائے ریاستی رٹ کی ضمانت سے آزادی کے حالات میں تشکیل نہیں پاتی تو اس کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ اور یہ بات ریاست کی بقا کے لیے خطرناک بھی ہو سکتی ہے۔ یہ عوامی رائے سے مماثل ہونے لگتی ہے جو فسطائی اور اجتماعی ریاستوں میں ظالم ریاست کی پراپیگنڈہ مشینری سے پیدا ہوتی ہے۔ پاکستان میں عدم آزادی، ریاست کی رٹ کمزور ہونے سے پیدا ہونا اور پانچ ستونوں یا اداروں کا افسر اعلیٰ کے خلاف گینگ بنالینا عوامی ملکیت جیسے رجحانات کا سبب بن جاتا ہے۔ اس بات نے معروض میں جوڑ توڑ سے آشنا کرایا ہے اور ریاستی معاملات میں ماہرانہ ہاتھوں نے، ان علاقوں میں عدالتی مداخلت کا رجحان پیدا کیا ہے، جہاں عوامی رائے کا حوالہ دینے سے زیادہ ماہرین کی ضرورت تھی۔

عوام کے مملکت کے اصول کی تشریح، جمہوری معاشروں میں منفی طرز میں کی جاتی ہے۔ وہ معاشرے جن کو سیاستدان سائنسی خطوط پر چلاتے ہیں۔ اس کے خطرناک امتیازی روپ میں دقیانوسی معاشرے اور ریاستیں شامل ہوتی ہیں اور ان مخصوص دقیانوسی اذہان کی توسیع عقائد سے ہوتی ہے۔ پاکستان کے معاملے میں عوامی رائے جو بنی اس نے معیشت کو تباہ کر دیا ہے۔ اور خارجہ پالیسی میں رویے کی لچک کو کم کر دیا ہے۔ یا اس نے لوگوں کو خارجہ پالیسی کے آپشنز کو مشروط اطاعت اور قومی غیرت سے دھوکہ دہی کے طور پر دیکھنے کا عادی کر دیا ہے۔

کیا میڈیا پاکستان میں اچھے انتظام کو فروغ دے رہا ہے

خالد احمد

برک نے کہا تھا کہ پارلیمنٹ میں تین ریاستیں ہوتی ہیں لیکن رپورٹر گیلری میں ان تینوں سے بہت زیادہ اہم ریاست براجمان ہوتی ہے۔

Thomas Carlyle, Heroes and hero worship.

میرے خیال میں اچھی خبر، قوم کی خود سے گفت وشنید ہے۔

Miller

ٹی وی کا ایک اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان کے پاس صفحہ نمبر 2 نہیں ہوتا۔ نتیجتاً ہر بڑی کہانی کا ایک جیسا کھیلا ہوتا ہے اور ناظرین تک واقعی بڑے اور ڈراؤنے کھیل کے طور پر پہنچتا ہے۔

Art Buchwald, 1969

اگر آپ اخبار نہیں پڑھتے ہیں تو آپ بے خبر ہیں۔ اگر آپ پڑھتے ہیں تو آپ کے پاس غلط اطلاع ہوتی ہے۔ مصنف نامعلوم

Commonly attributed to Mark Twain or Thomas Jaffery

میڈیا کو اگر آزاد ہونے کی اجازت ہو تو وہ ریاست میں لوگوں کا رکھوالا ہے۔ یہ احتساب کے لیے عوامی دفتر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان حقائق کو ظاہر کرتا ہے جو حکومت پر کھلی ڈلی حکومت ہونے پر زور دیتا ہے۔ منتخب حزب اختلاف کے بجائے یہ مناقشانہ اور معاندانہ کردار ادا کرتا ہے تاکہ عوام کی حکومتی کام میں رہنمائی کر سکے۔ اس کے فیصلوں کی کسوٹی آئین اور قانون کا کردار ہے۔ اسے

ریاست کا چوتھا ستون یعنی مجلس قانون ساز، عدلیہ اور افسر اعلیٰ سے زیادہ طاقتور ثابت ہوتا ہے۔

پارلیمنٹ ایسی جگہ ہے جہاں کھلی حکومت کا تصور منتخب حزب اختلاف کے افسر اعلیٰ کے رویے کے بارے میں سوالات کرنے سے عیاں ہوتا ہے۔ عدلیہ، آئین اور نافذ قوانین کی روشنی میں اس رویے کا جائزہ لیتی ہے۔ لیکن دونوں ادارے اپنے اختیار کا استعمال اپنی حدوں میں کرتے ہیں۔ منتخب حزب اختلاف تفتیشی انداز میں آگے بڑھنے کا عہدہ نہیں رکھتی، جو حقائق تک پہنچنے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ عدلیہ، درخواست کی حد تک محدود ہوسکتی ہے۔ اس کی اپنی پابندیاں ہوتی ہیں۔ اور مجلس قانون ساز میں افسر اعلیٰ پارٹی کی نمائندگی کے طور پر حکمرانی کرتا ہے۔

میڈیا پر کسی قسم کی پابندیاں نہیں ہیں۔ اس کی حکومت رویے کی تفتیش اور چھان پھٹک کی اہلیت صرف اپنے اختصاصی علم تک محدود ہے۔ یہ قابلیت جمہوری دنیا میں انعام اور تحفہ سمجھی جاتی ہے۔ ایک حد تک خفیہ قوانین کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے یا انہیں قانونی کتاب سے مٹا دیا جاتا ہے۔ عوام کو باخبر رکھنے کا وظیفہ برتر ہے، اور یہ اطلاعات سے ممکن ہوتا ہے جس سے احتساب کا حصول بھی ہوتا ہے۔ تمام حکومتیں اطلاعات کے ذریعے اپنے انتظامی امور کو ظاہر کرنے کے اس طریقے کے لیے برداشت کو بڑھاتی ہیں۔ یہ تمام معاشروں میں قبول شدہ ہے۔ جو پریس کی آزادی سے فائدہ اٹھاتے ہیں، کہ صحافیوں کے کچھ گناہوں کو ظالمانہ قوانین کو طاقت میں لانے سے بچانے کے لیے تحمل و برداشت کرنا چاہیے، جو معاشرے کے کھلے تصور پر نقب لگا سکتے ہیں۔

پاکستان میں میڈیا کی کیا حالت ہے۔ کیونکہ میڈیا کی آزادی ابھی کی بات ہے جبکہ ٹی وی چینلز کی افزائش بہت تیز ہے۔ کچھ نقائص واقعاتی طور پر تصور کیے گئے تھے جو رفتہ رفتہ عوامی ردعمل کی مانیٹرنگ اور ماہر ناقدین کے سبب زائل ہو جائیں گے۔ اگر نیوز چینلز تیزی سے بڑھ رہے ہیں اور وہاں گفتگو کے شوز ہو رہے ہیں جن میں مدمقابل غصے میں ایک دوسرے کا مقابلہ کر رہے ہیں، تو اینکرز اپنی تربیت میں کوتاہی اور کمی ظاہر کر رہے ہیں۔ اور اس کے تمام منفی اثرات ان کے اپنے کام سے کم آشنائی کی وجہ سے ہیں۔ اور یہ بات مطلق ہو چکی ہے۔

32 چینلز ہیں جو خبریں بھی دے رہے ہیں اور ٹاک شوز کے ذریعے تبصرے بھی پیش کر رہے ہیں، جن کی اینکرز کو اجازت ہے۔ لیکن ان میں سے بہت سے اینکرز اس کام کے لیے موزوں نہیں ہیں۔ براڈ کاسٹنگ کی اخلاقیات سے عدم واقفیت کی بنا پر، یا ان میں پیشہ ورانہ کمی ہے، یا ان

میں غرور اور تکبر ہے۔ چینلز کو اشتہارات سے بہت کم کمائی ہوتی ہے اور اکثر چینلز نقصان میں جا رہے ہیں۔ ان کے ذہنوں میں کامرس کے بجائے سیاست اور فنڈنگ ہے۔

کچھ چینل تو بہت سیاسی ہو چکے ہیں۔ ان کے مالکان خود چلا رہے ہیں اور وہ انہیں اپنے ایجنڈے کو آگے بڑھانے کے لیے اشتہاری مہم کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ ان کی سیاسی جانبداری کی واضح شہادت موجود ہے جو بعض اوقات کسی افواہ کو خبر میں ڈھال کر دھوکہ دینے سے ظاہر ہوتی ہے۔

چینلز کے رویے اور اخلاق پر تنقیدی تبصرہ کبھی بھی نشر نہیں ہوا۔ کئی کالم نگار اپنی بے اطمینانی کا اظہار کر چکے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے خبر نشر کرنے کے طریقے سے بھی بدظن ہیں۔ خبر اس طرح پیش کی جاتی ہے جس سے چینل کی جانبداری واضح ہو جاتی ہے۔ اور اینکرز جو گفتگو آگے بڑھاتے ہیں ان کے بارے میں یہ دریافت ہو چکا ہے کہ ان کا متعلقہ موضوع پر علم بہت کم ہوتا ہے، جس پر بحث کی جاتی ہے۔ بہت عام سی فریاد جس کا تعلق اینکر کی اس کوشش سے ہے جو وہ اپنے مبصرین کو لڑانے کے لیے کرتا ہے، جو کہ پروگرامز کی ریٹنگ کی کسوٹی ہے۔ زیادہ تر چینل دو حریف مبصرین کو آمنے سامنے بٹھاتے ہیں، جن سے جھگڑے کی بہت زیادہ توقع ہوتی ہے اور گفتگو کو زبانی کشتی میں بدل دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ کچھ مقرر کو گھونسے مارنے کی دھمکی بھی دیتے ہیں۔

کھلی حکومت کے لیے احتساب بہت سخت عمل ہے۔ پہلے پارلیمنٹ حزب اختلاف کی مدد سے عمل داری (گورننس) کی چھان بین کرتی ہے۔ اس اجلاس میں تمام اراکین موجود ہوتے ہیں اور یہ اجلاس میڈیا کے لیے کھلا ہوتا ہے۔ پاکستان میں میڈیا کے تسلط کا معیار یہ ہے کہ کئی برس سے حزب اختلاف کے سیاستدان جو سوال پوچھتے ہیں وہ میڈیا کی رپورٹس سے اخذ کیے جاتے ہیں۔ دوسرا ادارہ جو انتظام کی سکروٹنی کرتا ہے وہ اعلیٰ عدلیہ ہے۔ فریادی پارٹیاں اپیلٹ کورٹس تک اپیل کے ساتھ رسائی کرتی ہیں، اور قانونی نکتے سے حکومت کے کچھ اقدام کرنے اور کچھ ترک کرنے کو چیلنج کرتی ہیں۔ عدالت حکومت کو آئین اور قانون کا پابند کرتی ہے۔ لیکن یہ عمومی طور پر فریادیں سننے تک محدود رہتی ہیں، جو عام شہریوں کی ہوتی ہیں۔

تاہم اعلیٰ عدلیہ عوامی مفاد پر انحصار کرتی ہے اور سوموٹو ایکشن لیتے ہوئے کیسز کی سماعت کرتی ہے۔ اور اس کا دائرہ آگے تک بڑھا کر ان شہریوں تک جاتی ہے جو عدالت تک کسی وجہ سے رسائی

نہیں کرتے۔ اس قسم کے انصاف کے لیے عدلیہ میڈیا کی رپورٹس پر انحصار کرتی ہے۔ اعلیٰ عدلیہ غالب حد تک سوموٹو ایکشن کے لیے میڈیا کی طرف جھکاؤ رکھتی ہے۔ یہ بہت خاص قسم کی سچوایشن ہے جس میں میڈیا اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود، جو اوپر بیان کی گئی ہیں، قابل عمل اصلاح کے ذرائع مہیا کرتا ہے۔ یہاں میڈیا سے مراد پرنٹ اور الیکٹرانک ہے کیونکہ ٹی وی چینلز پر زیادہ تر اینکرز مختلف اخباروں کے لیے کالم لکھتے ہیں۔ لیکن کیا چینلز کی مہیا کردہ کوریج کا معیار مطلوبہ ہے؟ 2005ء میں زلزلے کی کوریج منفی ہوگئی تھی جیسے کوئی احتساب ہو رہا ہو۔ 2010ء میں اس کا حد سے بڑھا ہوا منفی رویہ یکساں رہا، اگر زیادہ پُرشدت نہیں بھی ہے، جس طرح میڈیا ماہرین کا یہ مشاہدہ ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عوام کی بڑی تعداد کا خیال ہے کہ میڈیا نے عمومی طور پر اور چینلز نے خصوصی طور پر پی پی پی کی حکومت کو احتساب کے نام پر بہت زیادہ ہدف بنائے رکھا۔ کچھ وہ لوگ بھی ہیں جو اسے غلط خیال کرتے ہیں اور کچھ ایسے لوگ بھی کثرت میں ہیں جو یہ خیال کرتے ہیں کہ حکومت اس سخت تنقید کی حق دار تھی۔ توجہ طلب بات یہ ہے کہ ناظرین کو بھی اس بات پر یقین آنا شروع ہو گیا کہ پی پی پی کو دوسری پارٹیوں کی نسبت بہت زیادہ تنقیدی ہدف بنایا گیا۔ اور عدلیہ میں ججوں سے زیادہ پی پی پی کے ظلم وستم کو عیاں کیا جاتا۔

یہ ایسی جانبداری ہے جس نے میڈیا کے خلاف تلخ تبصروں کی حوصلہ افزائی کی۔ اگر پی پی پی کی حکومت اپنی مس گورننس کی وجہ سے گر جاتی تو بہت سے لوگ یہ سوچنا شروع کر دیتے کہ قبل از وقت یہ حکومتی انہدام جانب دار میڈیا کی وجہ سے ہوا۔ پس سیاسی طور پر پی پی پی، جو اخلاقی شکست سے بہت دور تھی، دوبارہ سیاسی اثر ورسوخ پکڑ لیتی ہے کیونکہ غلط پارٹی نے اس بار بھی غلط کام کیا۔ یہ کام فوج کے ذریعے نہ ہوتا بلکہ میڈیا کے ذریعے ہوتا۔ میڈیا نے مشرف کے ساتھ بھی اسی غلطی کا ارتکاب لال مسجد کے معاملے میں کیا۔ ادھر پرنٹ میڈیا اور چینلز کو مؤرخین نے سخت تنقید کا نشانہ بنایا کہ انہوں نے اس بحران میں پوری سچائی بیان نہ کی۔

ٹی وی کوریج کی شدت نے کچھ ٹی وی اینکرز کو اضافی مدد دی جو دیگر اردو اخبارات میں کالم لکھتے ہیں، عام آدمی کو اس بات کا قائل کر لیا کہ حکمران جماعت پی پی پی میڈیا کی مخالفت کر رہی ہے۔ اور یہ بات اس کی قبل از وقت حکومت گرانے کی مہم کا حصہ ہے۔ یہ نہیں کہنا ہے کہ حکومتی خرابی

اور کرپشن کی کوریج غلط طریقے سے ہو رہی ہے، یا یہ کہ جو لوگ اس ظلم کو حقیقی سمجھتے ہیں ٹی وی چینلز ان کی مخالفت کرتے ہیں۔ حقیقت میں ناظرین کی اکثریت میڈیا کو جانبدار دیکھنا چاہتی ہے اور جاری رکھنا چاہتی ہے کہ پی پی پی کو حکومت سے بعد میں بے دخل کرنے کی بجائے جلد بے دخل کیا جائے۔ اگرچہ پی پی پی مخالف ماحول کے اس تماشے کو اقلیتی رائے کی حمایت حاصل نہ ہوسکی، تاہم سندھ کے دیہات میں جہاں پی پی پی کا غلبہ ہے وہاں یہ بات عام ہوگئی کہ پی پی پی کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ اس سے زیادہ خطرناک یہ بات تھی کہ اس میڈیا کے ظلم کو پاکستانی فوج کی ماضی کی پی پی پی کے خلاف جانب داری سے جوڑا جا سکتا ہے۔ اس قسم کی فہم پہلے سے اپنی جگہ بنا چکی ہے کہ پی پی پی اور عدلیہ کے درمیان ٹکراؤ کی کیفیت ہے۔ کیا میڈیا منفی کوریج کے اس انداز کی تصحیح کر سکتا ہے جو وہ اطلاع کے ذریعے کڑا احتساب کرتا ہے۔ خاص طور پر جب کئی معاملات میں رپورٹرز کو پہلے صفحے پر رپورٹنگ کے بجائے تبصرے کی اجازت ہے۔ کچھ ظالم اینکرز کو میڈیا احتساب کے ذریعے عیاں کرنے کی ایک چینل پر کوشش کی گئی لیکن اینکرز نے اپنا کیس اچانک غصہ میں آ کر اور بے عزتی کرنے والا انداز اپنا کر، خود خراب کر لیا۔

میڈیا آزاد ماحول میں اپنا وظیفہ انجام دیتا ہے: سیاسی نظام کو لازمی طور پر صحافی کو ان قوتوں سے محفوظ رکھنا چاہیے جو اسے یقینی قسم کی سرگرمیوں کی رپورٹنگ سے باز رکھنے کے لیے نقصان دینا چاہتی ہیں۔ میڈیا کو بذات خود اس عجیب و غریب کھیل کے میدان کا شعور ہونا چاہیے، جب یہ رپورٹنگ کی غرض سے آتا ہے۔ تاکہ اس کا منتخب کردہ ہدف، جو ادارہ ہو اس کی توجہ حاصل کر سکے۔ اگر ملک تھوڑی آزادی اور تھوڑی علاقائی بالادستی کے حالات میں ہو تو پھر اس کے اہداف بھی متنازعہ ہو جاتے ہیں۔

پاکستان میں میڈیا منیجرز کو کوریج کی اس اشتراکیت کا شعور ہونا ضروری ہے، جو ٹی وی چینلز جائز سمجھ کر حکومت کی گورننس پر حملے کر رہے ہیں وہ تحریک طالبان کے دہشت گردوں کے خلاف مؤثر رپورٹنگ کے قابل نہیں۔ ٹی وی پر بیت اللہ محسود کا پہلا فوٹوگراف اس کی موت کے بعد دکھایا گیا۔ کیونکہ اس نے حکم دیا تھا کہ اس کی تصویر کو عوام میں نہ دکھایا جائے۔

کوریج کے خوف کا سلسلہ طاقتور مولویوں تک پھیلا ہوا تھا، جن کے مدارس، چینل یا اس کے رپورٹر پر تشدد بھی آزما سکتے ہیں۔ لازمی طور پر مالاکنڈ اور فاٹا میں دہشت گردوں کے ہاتھوں کئی

صحافی جان کھو بیٹھے یا زخمی ہوئے۔اس کا براہ راست اثر ٹاک شوز پر بھی ہے، جہاں حقیقی گفتگو سادہ طریقے سے ممکن نہیں۔ٹی وی مباحث میں سچے اسلام کے طور پر اختیار کیے گئے اصول پر کوئی سیکولر تبصرہ ممکن نہیں۔اور یہ بات اینکرز پر بھی اپلائی ہوگی جن کے تبصرے کا غصہ صرف سیاستدانوں کے لیے محفوظ ہے،جن کی مولوی مخالفت کرتے ہیں۔

دہشت گردوں کی مدد

ڈاکٹر مہدی حسن

پاکستان گزشتہ کئی سال سے دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے۔ جہاں تک شدت پسندی اور عدم برداشت کا سوال ہے تو یہ رویہ پاکستانی قوم کو اکتیس سال پہلے ملک کے تیسرے اور بدترین فوجی آمر نے تحفے میں دیا تھا جس کا خمیازہ قوم آج تک بھگت رہی ہے۔ دہشت گردوں کی کاروائیوں میں انتخابات کے اعلان کے ساتھ ہی اضافہ ہو گیا تھا اور ان کا نشانہ وہ جماعتیں اور وہ افراد بننے شروع ہوئے تھے جو دوسری بہت سی جماعتوں اور گروہوں کے مقابلے میں سیاسی مقاصد کے لئے مذہب کو استعمال نہیں کرتے، مذہبی نعرے لگا کر اور ایک مخصوص قسم کی شخصیت اختیار کئے ہوئے افراد اور ان کے لواحقین بہت نمایاں طور پر مذہب کے نام پر ہونے والے تشدد سے محفوظ ہیں،

جنرل ضیاالحق کا دور حکومت مذہب کے نعرے بازوں کے لئے اقتدار کا سنہری زمانہ تھا، وہ عناصر جنہیں ان کے ہمسائے بھی نہیں پہچانتے تھے اسلام آباد میں اقتدار کی راہداریوں میں گیارہ سال تک گھومتے پھرتے رہے، اس دور میں لفظ ''اسلام'' اسلام آباد میں پذیرائی حاصل کرنے کا ایک آزمودہ اور کارگر نسخہ ثابت ہوا۔ سیاسی میدان کے علاوہ دوسرے تین شعبے جنہیں ضیاالحق نے کرپٹ کیا ان میں صحافت، نوکرشاہی اور منڈیوں اور شہریوں کے درمیانے درجے کے تاجر اور دکاندار شامل تھے۔ صحافت کے میدان میں کیوں کہ صحافی اس تاریک دور میں آزادیءاظہار اور جمہوری حقوق کی جدوجہد میں ہراول دستے کا کردار ادا کر رہے تھے، جیل جا رہے تھے، قلعے کے ٹارچر سیلوں میں بند تھے، بیروزگار ہو رہے تھے اور کوڑے کھا رہے تھے، اس لئے مارشل لاء کے

منصوبہ سازوں نے ان حریت پسند صحافیوں کے مقابلے پر مٹھی بھر معروف اور پیشہ ورانہ لحاظ سے نااہل افراد پر مشتمل ایک گروہ کھڑا کیا جسے سرکار دربار میں ''دامے، درمے، سخنے ہر طور سے بھرپور سرپرستی مہیا کی گئی، دربار میں پذیرائی کے لئے بھٹو اور پیپلز پارٹی کو گالی دینا اقتدار کی راہداریوں میں پذیرائی کا گیٹ پاس تھا اور اسی گیٹ پاس کے ذریعے سے اپرنٹس سب ایڈیٹر اور بغیر تنخواہ کے ''رپورٹر'' کا لیبل سینے پر سجائے نیم خواندہ افراد پاکستان کی صحافت کے ستون قرار پائے۔ اور سرکار دربار کے مہیا کردہ سرمائے سے بہت سے چیتھڑوں کے ایڈیٹر، چیف ایڈیٹر اور کالم نویس قرار پائے۔ بڑا اور بااثر صحافی ہونے کی سند کے طور پر خفیہ ایجنسیوں سے تعلقات اور روابط کو استعمال کرنے کا طریقہ بھی اسی دور کا تحفہ ہے جو آج تک سکہ رائج الوقت ہے۔

جنرل ضیاالحق گیارہ سال تک جس شدت پسندی کے فلسفے کو پروان چڑھاتے رہے وہ ان کے انتقال کے بعد بھی اسی شدت کے ساتھ جاری رہا کیونکہ ضیاالحق کے نظریات کو چیلنج کرنے والی پیپلز پارٹی اور اس کی نئی اور نوجوان لیڈر شپ روایتی اور خاندانی موقع پرستوں کے نرغے میں تھی۔ انہوں نے نظریات کو اہمیت دینے کی بجائے ''کرسی'' بچانے کی تگ و دو میں ساری طاقت صرف کردی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنرل ضیاالحق کے تیار کئے ہوئے مہرے اپنی اپنی جگہوں پر قائم رہے اور مضبوط سے مضبوط تر ہوتے چلے گئے، سیاست کے میدان میں بھی پیپلز پارٹی کو جنرل ضیاالحق کی بہت زیادہ باوسائل باقیات کا سامنا تھا، جس کا موثر توڑ صرف نظریاتی سیاست سے ممکن تھا۔ تاہم بہت معمولی اکثریت سے حکومت بنانے والی پارٹی نے باقیات ضیاالحق اور پارٹی دشمن اسٹیبلشمنٹ کا مقابلہ ''دولت، شہرت اور خوشامد'' سے کرنا چاہا جس نے ضیاالحق کے فلسفے کو مزید طاقتور کیا۔

جب جنرل پرویز مشرف نے اہلِ مغرب سے اپنے آئینی اقتدار کو قبولیت دلوانے کیلئے پاکستان اور امریکہ کے تیار کردہ مذہبی شدت پسندوں کے خلاف افغانستان میں اقوام متحدہ کے منظور کردہ فوجی کاروائی کی غیر مشروط حمایت کا اعلان کیا تو شدت پسندوں نے جو پاکستانی سرزمین اور یہاں کے وسائل کو ضیاالحق فلسفہ کے مطابق اپنی جاگیر سمجھتے ہیں اور اپنے فلسفے کو امریکہ کے مہیا کردہ اسلحہ اور تربیت کے زور پر تمام دنیا پر مسلط کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، پہلا ٹارگٹ پاکستان کو بنالیا۔ پاکستان کے ''ترقی پسند'' رواداری پر یقین رکھنے والی اکثریت جو ضیاالحق کے دور سے ہی

خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے، آج کے حالات جنگ میں بھی مسلسل خاموشی اختیار کئے ہوئے ہے، جبکہ ضیا دور کے صحافتی نظریات کے حامل صحافی، قومی مفاد، قوم کی مشکلات اور پاکستان کے مستقبل کو نظرانداز کرتے ہوئے آزادیءاظہار کے نام پر انتہا پسندی کو بھرپور کوریج مہیا کررہے ہیں۔

پاکستان کے اخبارات اور نوزائیدہ نجی ٹی وی چینلز کے بعض رپورٹر، تبصرہ نویس اور نیوز اینکرز اپنے حریفوں کے خلاف پوائنٹ سکور کرنے کے شوق میں جس انداز سے بیانات اور تبصروں کو اپنے اخبارات کے صفحات اور ٹی وی سکرینوں پر جگہ دیتے ہیں انہیں پڑھ کر، سن کر اور دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اخبارات اور ٹیلی ویژن کے ''بڑے'' یا تو اتنے نااہل ہیں کہ انہیں اپنی کوریج کے عوام پر، اور پاکستان کے بین الاقوامی امیج پر اثرات کا اندازہ نہیں ہے اور اگر وہ اپنے آپ کو ''اہل'' قابل اور تجزیہ کار'' صحافی سمجھتے ہیں تو پھر وہ یقیناً جان بوجھ کر شدت پسند عسکری باغیوں کو پروموٹ کرکے پاکستانی عوام کو خوفزدہ اور بے حوصلہ کررہے ہیں۔ گزشتہ دنوں لاہور میں گڑھی شاہو میں جوس کی چند دکانوں میں بموں کے متعدد دھماکے ہوئے جن میں ایک نوجوان ہلاک اور متعدد زخمی ہوئے۔ دھماکوں کی ذمہ داری قبول کرنے والی تنظیم نے یہ اعلان کیا کہ جوس کی ان دکانوں میں ''لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے بیٹھ کر جوس پیتے تھے، جو فحاشی کے مترادف ہے'' اور ان دکانوں کو اسی فحاشی کی سزا دی گئی ہے۔ دھماکوں کے دو روز بعد انگریزی کے ایک اخبار اور اردو کے متعدد اخبارات نے بڑے اہتمام کے ساتھ یہ خبریں شائع کیں کہ یہ ''جوس کی دکانیں واقعتاً نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے ملاقات کے اڈے تھے اور شام کے اوقات میں یہاں لڑکے اور لڑکیاں ملاقات کرتے تھے۔'' چار اور پانچ کالم کی ہیڈ لائنیز کے ساتھ ان خبروں نے بم دھماکے کرنے والی تنظیم کے موقف کو دہرا کر بم دھماکوں کے جواز کو جائز قرار دے دیا۔ یہاں پھر ایک بہت اہم سوال یہ ہے کہ ان ''جغادری'' رپورٹر حضرات نے یہ ''تحقیقاتی خبر'' کہ جوس کی دکانوں میں کھلے عام فحاشی ہورہی ہے، بم دھماکوں سے پہلے کیوں شائع نہیں کی۔ دوسرا اہم سوال یہ ہے کہ کیا لڑکے اور لڑکیوں کا جوس کی دکانوں پر اکٹھے بیٹھ کر جوس پینا فحاشی قرار دیا جاسکتا ہے؟ اگر اس سوال کا جواب اثبات میں ہے پھر طالبان جس طرز زندگی کو پاکستان میں رائج کرنے کیلئے مسلح بغاوت کئے ہوئے ہیں اس کے مطابق موٹر سائیکلوں پر عورت مرد کا اکٹھے بیٹھنا بھی فحاشی ہے۔ اور طالبان کے افغانستان کی طرح خواتین مریضوں کا مرد ڈاکٹروں سے علاج کرانا بھی فحاشی قرار

پائے گا۔ ان جغادری رپورٹر حضرات نے جوس کی چھوٹی چھوٹی دکانوں میں ہونے والی فحاشی کی تحقیق پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ انہوں نے شدت پسند عناصر کو اگلے ٹارگٹ بھی مہیا کر دیئے اور عوام کو خوفزدہ کرنے کیلئے بھرپور کردار ادا کیا جب انہوں نے بالواسطہ طور پر یہ تجویز کیا کہ اگلا حملہ ہال روڈ کے سی ڈی اور میوزک فروخت کرنے والوں پر اور باغ جناح اور ریس کورس پارک میں خواتین و حضرات جو اکٹھے سیر کرتے ہیں ان پر کیا جائیگا۔ یہ خبر شائع کرنے والوں کو یہ اندازہ ہے کہ اس خبر سے ہال روڈ کے دکانداروں کے کاروبار اور پارکوں اور باغوں میں سیر کرنے والوں کی زندگی پر کیا اثر پڑے گا۔ کیا ان جغادری صحافیوں کو یہ معلوم ہے کہ وہ دہشت گردوں کے حوصلے بلند اور عوام کے حوصلے پست کرنے کا باعث بن رہے ہیں۔

عبدالرشید غازی ہیرو بنا دیا گیا

ڈاکٹر مہدی حسن

اسلام آباد میں گزشتہ چھ ماہ سے جاری جنگ پسند مہم بہت سے جانی نقصان اور حکومت اور جامعہ حفصہ اور لال قلعہ کہنا زیادہ مناسب ہے، کے مکینوں کی بدنامی کے بعد اپنے منطقی انجام کو پہنچ گیا۔ یہ المیہ جس کی ابتدا لال مسجد کے مکینوں کی اپنے بارے میں بعض غلط فہمیوں کی بنا پر ہوئی تھی سارے ملک میں ایک ہفتے سے زائد عوام کو شدید ذہنی اور بہت سے لوگوں کو جسمانی تکلیف میں مبتلا رکھنے کے بعد بہت سے سوالات پیچھے چھوڑ گیا ہے۔ اس سوالات میں سے کئی کے جواب تو وقت کے ساتھ خود ہی منظر عام پر آجائیں گے مگر کچھ سوالوں کے جواب پاکستانی روایات کے مطابق شاید عوام کو کبھی نہیں مل سکیں گے۔

اسلام آباد کے مرکز میں رونما ہونے والے اس المیے کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں بہت سے سبق بھی موجود ہیں بشرطیکہ ہم ان سے کچھ سیکھنا چاہیں۔ لال مسجد اور اس کے اردگرد ایک ہفتے تک جاری رہنے والی ''جنگ'' کے دوران پاکستان کے نوزائیدہ پرائیویٹ ٹیلی ویژن چینلز میں سے چند بڑے اداروں کیلئے یہ واقعہ زلزلے کی تباہی اور عدالتی بحران کے دوران چیف جسٹس کے مختلف شہروں کے دوروں اور کراچی کے سانحہ کے بعد ایک اور ایسا واقعہ تھا جس کی براہ راست رپورٹنگ کے دوران ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش میں صحافت کے بہت سے اصول اور اخلاقیات نظرانداز کر دیئے گئے۔ دراصل گزشتہ چند سالوں میں ملک میں پرائیویٹ چینلز خود روگھاس کی طرح نمودار ہو گئے ہیں اور وزارت اطلاعات فخریہ اعلانات کرتی رہتی ہے کہ اس وقت

ملک میں پچاس کے قریب چینلز شروع ہو چکے ہیں اور بہت سے مزید شروع ہونے والے ہیں۔ اتنے ٹی وی چینلز کے لئے جتنے تربیت یافتہ اور تعلیم یافتہ سٹاف کی ضرورت ہے وہ ملک میں دستیاب نہیں ہے اور نہ ہی ایسے معیاری ادارے موجود ہیں جن کے پاس جدید ترین سہولتیں ہوں اور ایسے تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ افراد ہوں جو اس جدید ترین ذریعہ ابلاغ کی تکنیکی اور معاشرتی اثرات کی سائنس کی تعلیم دے سکیں

نوزائیدہ ٹی وی چینلز کا بیشتر سٹاف نیوز رپورٹنگ کی خاص طور پر، براہ راست براڈ کاسٹنگ کیلئے ایک دوسرے سے مقابلہ بھی کرتے ہیں، لال مسجد کے مسلح تصادم اور چیف جسٹس کے جلوسوں کی رپورٹنگ کرتے وقت جس طرح جذباتی ہو جاتے ہیں اس سے دیکھنے اور سننے والوں کو یہ تاثر ملتا ہے کہ رپورٹر ایک غیر جانبدار پیغامبر نہیں ہے بلکہ خود ایک پارٹی ہے۔ مثال کے طور پر اسلام آباد میں چیف جسٹس کے پہلے جلوس کے موقع پر ایک چینل کے رپورٹر نے جلوس کی رپورٹنگ کرتے وقت بہت جذباتی انداز میں یہ اعلان بھی کیا کہ ''اب یہ تحریک روکنی ممکن نہیں ہے اور یہ تمام ملک میں پھیل جائیگی۔'' یہ رائے اگر کوئی مبصر یا تجزیہ کار دے تو بات سمجھ میں آتی ہے، رپورٹر کی طرف سے اس رائے کا اظہار صحافت کے مسلمہ اصولوں کے خلاف ہے۔ اس قسم کا اظہار رائے چیف جسٹس کے اسلام آباد سے لاہور تک کے جلوس میں بار ہا دیکھنے میں آیا۔ لال مسجد کے مسلح تصادم کے دوران آٹھ دن اور رات اپنے ناظرین کو کوئی ٹھوس اطلاع دیئے بغیر ان تمام چینلز کے رپورٹر جو اس محاصرے اور تصادم کو براہ راست رپورٹ کر رہے تھے، اپنے کانوں پر موبائل فون لگائے محض اپنے اندازوں کو یا بعض مفروضوں کو خبروں کے طور پر پیش کرتے رہے۔ ان کا ہر مفروضہ اور ہر اندازہ ''بریکنگ نیوز'' کے طور پر سارے دن اور ساری رات سکرین پر دہرایا جاتا رہا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان رپورٹر حضرات کو بریکنگ نیوز اور ''اپ ڈیٹ'' کی اصطلاحوں کا صحیح مطلب بھی معلوم نہیں ہے۔ تقریباً ہر رپورٹر نے ''اپنے ذرائع'' کا بہت فراخدلی سے استعمال کرتے ہوئے لال مسجد اور مدرسہ حفصہ کے مسلح محصورین کی مہیا کی ہوئی آراء کو تصدیق کے بغیر خبر کے طور پر پیش کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ میڈیا کی اس پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ رائے عامہ جو کافی عرصے سے حکومت پر یہ تنقید کر رہی تھی کہ لال مسجد کے مسلح رہائشیوں کی کھلے عام غیر قانونی سرگرمیوں کے خلاف اقدامات کیوں نہیں کئے جاتے، حکومتی اقدامات شروع ہونے کے صرف

پانچ دن بعد ہی غازی برادران کو ہیرو اور انکی لٹھ برادر جہاد کے نعرے بلند کرتی خواتین اور گیس ماسک منہ پر چڑھائے ہاتھوں میں مہلک ہتھیار اٹھائے سڑکوں پر دندناتے، مسجد کے ہمسائے میں سرکاری املاک کو نذر آتش کرتے مسجد کی چھت پر مورچے بنا کر بیٹھے ہوئے تشدد پسند ضدی افراد ''مظلوم'' سمجھے جانے لگے۔ ٹی وی چینلز کے بعض سینئر کمپئرز نے جن کا ٹیلی ویژن پر نیوز اور حالات حاضرہ کے پروگرام کرنے کا تجربہ پاکستان میں پرائیویٹ چینلز کی عمر کے ہی برابر ہے، اپنے طور پر صلح کرانے کا کام بھی سنبھال لیا اور اپنے طور پر یہ اعلانات بھی نشر کر دیئے کہ غازی برادران صلح کے لئے تیار ہیں! اب حکومت کا فرض ہے کہ وہ انکی ''سیف پیسج'' کی شرط تسلیم کر کے انہیں پرامن طریقے سے اپنی مرضی کی جگہ جانے دے۔ یہ کمال ہمارے ٹی وی رپورٹروں اور کمپئروں کا ہے جنھوں نے مدرسہ حفصہ اور لال مسجد کے مسلح مکینوں کو جنھوں نے آٹھ روز تک تربیت یافتہ پیشہ ور فوج کا بھرپور مقابلہ کیا، اور اس مقابلے کے دوران ٹی وی رپورٹر یہ اعلانات بھی کرتے رہے کہ فوج کے جوان جامعہ حفصہ کے پیچھے موجود خشک برساتی نالے کی طرف سے جا کر مدرسہ کی دیوار توڑنا چاہ رہے ہیں۔ ان رپورٹروں کے ''ذرائع'' نے انہیں بتایا ہوا تھا کہ مدرسہ اور مسجد کے مکین اندر ٹیلی ویژن بھی دیکھ رہے تھے۔ ان نیوز رپورٹروں کو یہ احساس بالکل نہیں ہوسکا کہ ان کے بیانات پورے ملک میں مذہبی انتہا پسندوں کو تشدد پر اکسانے کا باعث بن سکتے ہیں۔ ایک چینل کے کمپئر نے تو یہ فیصلہ بھی سنا دیا کہ ''یہ فیصلہ نہیں ہوسکا کہ عبدالرشید غازی حق پر تھے یا انتظامیہ جس نے ان کے خلاف مسلح کاروائی کی۔ اسکا فیصلہ تاریخ کرے گی کہ حق پر کون تھا۔'' ان رپورٹر حضرات نے فوجی کاروائی شروع ہونے کے دو گھنٹے بعد اس بات کا شکوہ شروع کر دیا تھا کہ کاروائی کے دوران ہلاک ہونے والوں کی تعداد نہیں بتائی جارہی جس کا جواب آئی ایس پی آر کے ڈائریکٹر جنرل نے یہ دیا تھا کہ فوجی سپاہی کاروائی کے دوران ہلاک شدگان کی گنتی نہیں کرتا بلکہ یہ گنتی ایکشن ختم ہونے کے بعد کی جاتی ہے۔ جس عمارت کے اندر اور باہر سے آٹھ دن تک مسلسل فائرنگ ہوتی رہی ہو اس کے بارے میں یہ کہنا ''مسجد کی دیواریں گولیوں سے چھلنی ہو چکی ہیں'' سادہ لوح مسلمانوں کو تشدد پر ابھارنے کیلئے بہترین نسخہ ہے۔ اس کے ساتھ اس قسم کی غیر مصدقہ ''بریکنگ نیوز'' کہ انتظامیہ نے ایک ہزار کفن منگوا لئے اور تین سو چادریں ہلاک شدگان کے جسموں کے ٹکڑے جمع کرنے کے لئے منگوالی گئیں'' غیر ذمہ دارانہ رپورٹنگ کی بہترین مثال

ہے۔

دراصل تربیت کی کمی کی وجہ سے رپورٹنگ اور نیوز کمپئرنگ کرنے والے صحافت میں ''گیٹ کیپر'' کے فرائض سے ناواقف ہیں۔اخبار، ٹی وی اور ریڈیو کا رپورٹر، نیوز ایڈیٹر اور پروڈیوسر ''گیٹ کیپر'' کا فرض ادا کرتے ہوئے ایسی تمام اطلاعات کو روک لیتا ہے جس سے معاشرے میں بدامنی،فساد اور بے چینی کا خدشہ ہو، بیشک ایسی اطلاع درست اور مصدقہ ہی کیوں نہ ہو۔ پاکستان کے اخبارات اکثر اس قسم کی خبریں بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کرتے ہیں جن میں کہا جاتا ہے ''ایک مسیحی نوجوان نے قرآن کی بے حرمتی کردی'' خبر کے متن میں کہا جاتا ہے کہ مسیحی نوجوان پر یہ الزام اس کے کسی ہمسائے نے عائد کیا ہے۔ لال مسجد کے مسلح تصادم کے دوران ٹی وی چینلز کے رپورٹروں اور کمپئروں نے نہ صرف گیٹ کیپر کا فرض ادا نہیں کیا بلکہ ناظرین کی معلومات میں کوئی اضافہ کئے بغیر انکی پریشانی میں اضافہ کیا اور اس المیہ کو بعض کارکنوں نے اپنی پبلسٹی کے لئے بھی استعمال کیا اور ایک دوسرے کے ''انٹرویو'' لے کر یہ بتاتے رہے کہ کس طرح اپنی جان خطرے میں ڈال کر وہ یہ فرائض پورے کر رہے ہیں۔

جہادی اور ان کے سرپرست

ڈاکٹر مہدی حسن

اگر نااہل اور بے وقوفوں کے سرپر سینگ ہوا کرتے تو پاکستان بارہ سنگوں کی پیداوار میں نہ صرف خودکفیل ہوتا بلکہ خدا کی اس خوبصورت مخلوق کو تمام دنیا میں برآمد کر کے بے شمار زرمبادلہ بھی کمار رہا ہوتا۔ ویسے ہم نے تمام دنیا میں ''جہادیوں'' کو برآمد کر کے اقوام عالم میں جو نام کمایا ہے وہ بھی کوئی کم نہیں ہے لیکن ان جہادیوں سے خود جہادیوں اور ان کے سرپرستوں کے دن تو ضرور پھر گئے لیکن قوم کو بدنامی کے علاوہ اور کچھ حاصل نہیں ہوا بلکہ ٹیکس گزاروں کے خون پسینے کی کمائی کے لاکھوں ڈالر بہت سے جہادیوں کی جان بخشی پر خرچ کرنے پڑ گئے، حالانکہ جہاد کا سبق یہ ہے کہ جنت کے عوض اگر آپ کی جان، مال اور اولاد بھی قربان ہو جائے تو یہ خوشی کا مقام ہے اور جہادیوں کے سرپرست یہ اعلان کرتے نہیں تھکتے کہ ان والدین کے چہروں پر نور دیکھو جن کے بچے اور جوان جہاد کی راہ میں شہادت کے درجے پر فائز ہو چکے ہیں، یہ اور بات ہے کہ جہادیوں کے ان سرپرستوں کے بچے سرخ وسفید چہرے لئے قیمتی گاڑیوں میں گھومتے ہیں اور عالم اسلام کے دشمن امریکہ میں تعلیم حاصل کرتے ہیں یا اس دیار فرنگ میں جانے کی خواہش رکھتے ہیں، پھر اگر جہاد کرتے کوئی جہادی پکڑا جائے یا مارا جائے تو افسوس اور احتجاج کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے۔ کیونکہ جہادی جب جہاد شروع کرتا ہے تو اس کے نزدیک صرف ایک مقصد ہوتا ہے اور وہ مقصد جنت کا حصول ہوتا ہے۔

پاکستان کا نوزائیدہ الیکٹرانک میڈیا بھی گزشتہ چھ سات سال سے قوم کی خاطر جہاد میں

مصروف ہے، مبینہ طور پر لاکھوں روپیہ ماہوار تنخواہ پانے والے آدھی درجن خواتین و حضرات ''اینکر پیرسنز'' اور درجنوں رضا کار رپورٹرز، جو قوم اور صحافت کی خدمت کی خاطر دن رات بغیر معاوضے کے کام کرتے ہیں اور کان پر موبائل اور ہاتھ میں مائیکروفون پکڑ کر سامنے کیمرہ دیکھتے ہیں تو خود کو معاشرے کا سب سے اہم فرد سمجھتے ہیں پھر وہ اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر ایسا ایسا ''سکوپ'' لاتے ہیں کہ ناظرین عش عش کر اٹھتے ہیں۔ یہ سوچنے کی بات ہے کہ ان رپورٹرز کو یہ خبر بریک کرنے میں کتنی محنت کرنی پڑی ہوگی کہ شعیب ملک، جی ہاں وہی شعیب ملک جو آج کل ڈسپلن کی خلاف ورزی کی پاداش میں ایک سال کیلئے کرکٹ ٹیم سے معطل ہے اور جسے شادی کی مبارک باد دینے ایک وفاقی وزیر پاکستان کے بے شمار بحرانوں کو پسِ پشت ڈال کر وزیراعظم کی ہدایت پر پاکستان کی بہو کو لینے حیدرآباد بھی گئیں۔ یہ اور بات ہے کہ پاکستان کی بہو نے پاکستانیوں سے خوفزدہ ہو کر فوراً یہ اعلان کیا کہ اس نے شادی شعیب ملک سے کی ہے پاکستان سے نہیں کی ہے، ہوٹل سے ائرپورٹ روانہ ہو گیا ہے۔

بہر حال پاکستانیوں کے الیکٹرانک میڈیا کے محنتی رپورٹرز نے اپنی تحقیقاتی رپورٹنگ کی کاوشیں جاری رکھیں اور پاکستان میں لوڈشیڈنگ کی وجہ سے زندگی سے بے زار تاجروں، طالب علموں کارخانے کے بے روزگار مزدوروں، سڑکوں پر سینہ کوبی کرتے کلرکوں، احتجاج کرتے اساتذہ کو ہر وقت یہ اطلاع بہم پہنچائی کہ ثانیہ مرزا اور شعیب ملک ائرپورٹ پر پہنچ گئے ہیں، رپورٹر حضرات نے بہت محنت کر کے اور اپنا معلومات حاصل کرنے کا آئینی حق استعمال کر کے یہ اطلاع بھی بے قرار پاکستانی قوم کو دی کہ ثانیہ مرزا کی سیٹ کا نمبر 21۔ای ہے، انہیں تھکن کی وجہ سے ننانوے (99) بخار ہے، پی آئی اے کے جہاز کے کپتان اور ان کے عملے نے نوبیاہتا جوڑے کو پھولوں کے گلدستے بھی پیش کئے کیونکہ جہاز کے عملے کی طویل مدت سے نوکری کے دوران یہ پہلا موقع تھا کہ ایک نوبیاہتا جوڑا ان کے جہاز میں سوار ہوا تھا۔ اس کے بعد محنت کش رپورٹرز بھاگم بھاگ، ہانپتے کانپتے راولپنڈی اسلام آباد پہنچے جہاں ایک سال کی پابندی والے شعیب ملک کو سرکاری مہمان قرار دے دیا گیا تھا۔ حکومت بے چاری بھی کیا کرے جہادیوں کے جذبہ جہاد سے خوفزدہ ہو کر ایک مدت سے کھلاڑیوں نے پاکستان آنا چھوڑ دیا ہے اور وہ سب لشکر طیبہ کے خوف اور ماؤنواز کمیونسٹ گوریلوں کی سرگرمیوں کے باوجود ہندوستان کی رنگین فضاؤں میں اپنے بچپن

کے چھوٹے چھوٹے کپڑے پہنی ہوئی چیئر لیڈرز کے لٹکے جھٹکے دیکھنے بمبئی، مدراس، دہلی اور بنگلور میں مزے بھی کرتے ہیں، سٹہ بھی کھیلتے ہیں اور تفریح بھی کرتے ہیں۔ پاکستان آ کر تو انہیں جماعت اسلامی کے منور حسن کے مظاہرے ہی دیکھنے کو ملیں گے، اب اگر مقابلہ شلپا شیتی، پریتی زنٹا اور منور حسن کے درمیان ہو تو ظاہر ہے جیت کس کی ہوگی چنانچہ غیر ملکی کھلاڑیوں کے اس قحط کے زمانے میں ٹینس کی انڈین کھلاڑی پاکستان کی بہو کا جہاز اسلام آباد لینڈ ہونے سے پہلے نو بیاہتا جوڑے کو سٹیٹ گیسٹ کا درجہ دے دیا گیا، دراصل ہم ابھی تک ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کی روایات کے امین ہیں جو غیر ملکی سیاحوں کو فوراً خلعت سے نواز دیا کرتے تھے، اس موقع پر رپورٹرز اور کیمرہ مینوں نے پھر بڑی محنت کی اور ہوٹل کے اس سویٹ کا ایک ایک کونہ ناظرین کو دکھایا جس میں ثانیہ مرزا اپنی سہاگ رات منانے والی تھی، فوٹو گرافرز کا سکوپ یہ تھا کہ انہوں نے ڈبل بیڈ کے علاوہ پچھتر ہزار روپے روزانہ کے سویٹ کے باتھ روم کے کلوز اپ بھی دکھائے جن میں کموڈ کو خاص طور پر فوکس کیا گیا۔ وزیراعظم نے بجلی کے بحرانوں کی کانفرنس سے وقت نکال کر پاکستان کی بہو کے لئے عشائیے کا اعلان بھی کر دیا تھا لیکن شاید پہلی بار کسی مشیر نے کام کا مشورہ دیا اور اس مشورے پر عمل بھی ہوا کہ عشائیہ ملتوی کر دیا گیا اور اس ساری قوم کو وزیراعظم کا ممنون ہونا چاہئے کہ انہیں قوم کی تکلیفوں اور دکھوں کا کتنا احساس ہے۔

الیکٹرانک میڈیا کے محنت کش اور عوام دوست رپورٹرز صرف ثانیہ مرزا تک ہی محدود نہیں ہیں، ان کی تحقیقات صحافت کے اور بہت سے شاہکار ہیں، اگر مصطفےٰ کھر بوجوہ یہ کہہ دیتا ہے کہ بے نظیر بھٹو کو آصف زرداری نے قتل کرایا ہے تو ہمارا میڈیا ہتک عزت کو پس پشت ڈال کر اس کی سرخی بنا دیتا ہے اور کھر صاحب سے اس دعوے کا ثبوت نہیں مانگتا، البتہ اس کے جواب میں پیپلز پارٹی کا جیالا سینٹر یہ اعلان کرتا ہے کہ مصطفےٰ کھر دنیا کا سب سے بڑا منافق اور جھوٹا شخص ہے، ہمارا نیوز اینکر مسکرا کر اسے بھی براڈ کاسٹ کرتا ہے، جنرل مشرف کا وکیل ٹی وی چینل پر بیٹھے تین سیاستدانوں کو چور، بے ایمان، دھوکے باز، بد دیانت جھوٹا کہتا ہے، اور نیوز اینکر اس کی بات کو کاٹنے کی کوشش نہیں کرتا۔ کیا اس قسم کی صحافت کے بعد بھی پاکستان براڈ کاسٹنگ ایسوسی ایشن یہ کی جرأت کرے گی کہ ان کے لئے کوئی ضابطہ تجویز نہ کیا جائے۔؟